لندن کے سات رنگ

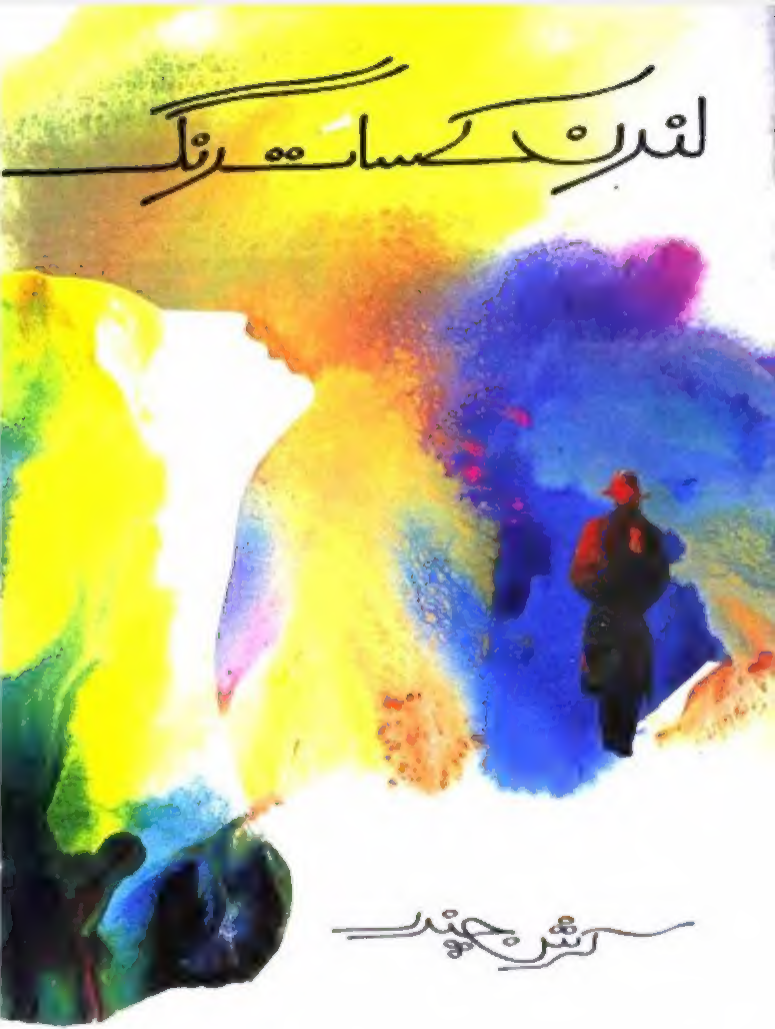

کرشن چندر

لندن کی پہلی شام

انگریزوں کی دو سو سالہ حکومت کی وجہ سے لندن کے نام سے رعب کھائے ہوئے تھے۔ کیسی حسرت تھی دل میں لندن کو دیکھنے کی، لڑکپن ہی میں کیسے کیسے رومانی نام سُن رکھے تھے۔ بانڈ اسٹریٹ، اکسفورڈ اسٹریٹ، پکڈلی، سوہو۔ نام جنہیں انگریزی ناول نگاروں نے بے انتہا گلیمر عطا کر دی تھی۔ جی چاہتا تھا۔ کسی طرح ایک بار اُڑ کر چلے جائیں لندن، اور دیکھ لیں وہ شہر جہاں دُنیا بھر کی طاقت اور دولت اکٹھی ہو رہی ہے۔

"لیکن جب لندن دیکھنے کو ملا تو دل بٹھس ہو کر بیٹھ گیا۔۔۔ اچھا تو یہ ہے لندن؟ نیم اندھیروں۔۔۔ پھیلی ہوئی بدبوؤں۔۔۔ چھوٹی چھوٹی سڑکوں۔۔۔ دُھند اور کہرے کا شہر! میمز کو دیکھ کر راوی یا گومتی کی یاد تازہ ہونے لگی اور ٹیکسیاں کتنی پُرانی؟ معلوم ہوتا ہے پُرانی ہڈیوں سے پہیے اُتار کر ٹیکیاں میں ربڑ کے ٹائر فٹ کر دیے گئے ہیں۔ اور ٹیکسی والے کتنے ٹھنڈے اور سست رفتار؟ معلوم ہوتا ہے رات کو ٹیکسی سمیت کسی بڑے فریجڈیر میں بند کر دیے جاتے ہیں۔ اپنے وطن کے سردار جی ٹیکسی والے بہت یاد آنے لگے۔ کیا تازہ ترین ماڈل کی ٹیکسیاں ہوتی ہیں؟ کیا برق رفتاری ہوتی ہے؟ ٹریفک لائیٹس اور ٹریفک کے سپاہی دونوں منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اور سردار جی ایک ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھے دوسرے ہاتھ سے سپاہی کو ٹاٹا کرتے ہوئے گاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ "بلّے نی گڈی وچوں لت لمکے۔ گورا رنگ تے سلیپر کالے۔ بلّے۔ بلّے۔"

"ایک یہ ہیں انگریز ٹیکسی والے۔ اس طرح ناپ تول کر باقاعدگی سے آگے پیچھے دیکھ کر چلتے ہیں، گویا سڑک کے بجلی کے کھمبوں کو شمار کرنے نکلے ہیں۔ ٹیکیاں تو

پیرس میں لندن سے بھی پُرانی ہیں۔ لیکن فرانسیسی ٹیکسی ڈرائیور اپنے وطن کے سردار جی سے بھی دو ہاتھ آگے رہتے ہیں یوں فل اسپیڈ سے موڑ کاٹتے ہیں گویا برف کی پھسلواں ڈھال پر (Skieing) کر رہے ہیں۔ ہر ایک سڑک ایک خطرناک مہم معلوم ہوتی ہے۔ ٹیکسی میں بیٹھنے والوں کے لئے بھی اور سڑک کراس کرنے والے کے لئے بھی۔ اسی لئے تو پیرس میں خون گرم ہوتا ہے اور لندن میں ٹھنڈا۔۔۔"

میری باتیں سن کر میرے میزبان قادر یار نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے تمہیں لندن پسند نہیں آیا۔۔۔؟"

ہم دونوں بی بی سی کے بغل والے جارجز بار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جارجز بار بی بی سی میں کام کرنے والے درمیانی طبقے کے ادیبوں، فنکاروں اور انجینئروں کا اڈہ ہے دہلی کے انڈیا کافی ہاؤس میں ایسے ایسے چار ریستوران سما سکتے ہیں۔ قادر یار مجھے کبھی تو ابرو کے اشارے سے، کبھی ہاتھ کی انگلی کے ایک مہذب اشارے سے انگریزی ادب کے اُن ادیبوں کے نام بتاتا جا رہا تھا جو اس وقت جارجز میں موجود تھے۔ سبھی لوگ اپنی اپنی بیویاں یا لونڈیاں لئے ہوئے بیئر پی رہے تھے سگار اور سگرینوں کے دھوئیں سے کمرہ بھرا ہوا تھا سب لوگ پاس پاس کھڑے تھے۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا، کہیں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی

"انگریز لوگ وھسکی نہیں پیتے؟" میں نے قادر یار سے پوچھا۔

"وھسکی زیادہ تر باہر بھیجی جاتی ہے۔ دِساورک وھسکی کی ساری دنیا میں مانگ ہے۔ اس لئے انگریز بیچارے کو وھسکی بہت کم نصیب ہوتی ہے۔ وہ تو بیئر اور تمباکو پر زندہ رہتا ہے۔" قادر یار نے کہا۔

قادر یار اور میں کسی زمانے میں لاہور میں ایک ہی جماعت میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ کبھی میں پاس ہوتا تو وہ فیل ہو جاتا۔ اور کبھی میں فیل ہو جاتا تو وہ پاس ہو جاتا۔ نتیجے میں جلد یا بدیر ہم لوگ اکثر ایک ہی کلاس میں پائے جاتے۔ ہوشیار طلبا، کا کہنا تھا کہ میر اور قادر یار کا مستقبل بہت مخدوش ہے۔ مگر وہ اس وقت بی بی سی کے پاکستانی سیکشن میں

ایک اعلےٰ عہدے پر فائز تھا اور میں ہندوستان سے یورپ کی سیاحت کو نکلا تھا۔ برسوں کے بعد لندن میں ہم دونوں مل گئے تو ایسا لگا جیسے کبھی کچھ تقسیم ہی نہ ہوا تھا۔

"انگریز لڑکیوں کے بارے میں تمہارا کیا تجربہ ہے؟" میں نے قادر یار سے پوچھا اور پھر خود ہی اُسے بتانے لگا۔ سُنا ہے بڑی مادیت پرست ہوتی ہیں، خود غرض ہوتی ہیں اور ہر معاملے میں دو اور دو چار کی گردان کرتی ہیں۔"

اُس نے بیئر کا ایک لمبا گھونٹ لیا۔ ایک طنز آمیز مسکراہٹ اُس کے لبوں پر آئی۔

"اور مشرقی عورت تو بڑی روحانیت پرست ہوتی ہے نا؟ اُسے نہ موٹر چاہئے۔ نہ گھر، نہ فرنیچر، نہ اچھا کمانے والا شوہر، وہ نہ کپڑے مانگتی ہے، نہ زیور۔ بلکہ صرف بہشتی زیور پر قناعت کرتی ہے نا؟"

میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "میں اُن لڑکیوں کی بات نہیں کرتا۔ میرا اشارہ وہ دوسری طرح کی لڑکیوں کی طرف ہے؟"

"اچھا... وہ؟" قادر یار نے "وہ" پر بہت زور دیا۔ چند لمحے خاموش پھر بولا۔ "حیرت ہے تمہیں لندن میں آئے ہوئے دو دن گزر گئے ہیں اور تم نے آج یہ سوال کیا ہے۔؟ حالانکہ اکثر دوست تو چھوٹتے ہی یہ سوال کرتے ہیں"

اب چُپ رہنے کی باری میری تھی۔

اِس دوران میں اُس نے بیئر کے تین گھونٹ لئے... "جیسی لڑکیوں کی تم بات کرتے ہو، ویسی لڑکیوں کی پسند بہت عجیب ہے۔" قادر یار بولا۔ "یہاں پر انگریز لڑکیوں کی پسند کے چار درجے ہیں۔"

"چار درجے؟"

"ہاں۔"

"پہلے درجہ میں امریکی آتے ہیں۔ دوسرے درجہ میں جنٹلمین۔ تیسرے درجہ میں عرب۔ چوتھے درجہ میں جمیکا کے ویسٹ انڈین۔ ان درجوں سے گذر کر جو لڑکیاں بچ جاتی ہیں، وہ پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کے ہاتھ آتی ہیں... اب تم سوچ لو وہ کیسی

ہوتی ہوں گی۔۔۔؟"

میں نے ہنس کر کہا۔ "اب یقین آیا کہ ہم واقعی بچھڑے ہوئے ملک ہیں۔"

قادر یار نے بیئر کا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا... "مگر یہ سب گُچھے دھرے رہ جاتے ہیں۔ ہر گُچھے کی طرح ان میں صرف آدھی سچائی ہوتی ہے۔ دو دن میں تم لندن کو نہیں سمجھ سکتے اور دوسروں کے تجربے سے تو بالکل نہیں سمجھ سکتے۔"

"تو پھر کیسے سمجھ سکتا ہوں؟"

"اکیلے گھومو۔"

"تمہارے ساتھ نہیں"

"بالکل نہیں... بالکل اکیلے گھومو۔"

"ممکن ہے کھو جاؤں؟"

"تو کھو جاؤ۔ لندن میں کھو کر ہی تم شاید لندن کو سمجھ سکو گے۔ اتنے پیسے بھی نہیں ہو میرے گھر کا ایڈریس تمہاری ڈائری میں محفوظ ہے۔"

"تو آج شام میں لندن کو ڈھونڈ ھتا ہوں۔" میں نے قادر یار سے کہا۔

"اور میں گھر کی بس پکڑتا ہوں۔ جب جی چاہے آجانا۔"

قادر نے ہم دونوں کا بل ادا کیا اور جارجز سے باہر نکل گئے۔

میں اکیلا گھومنے لگا۔۔۔

آکسفورڈ اسٹریٹ کے درزیوں کی دوکانیں دیکھ کر انارکلی لاہور کے درزیوں کی دوکانیں یاد آگئیں۔ جو زیادہ تر انارکلی کے بغل کی گلیوں میں کھلتی ہیں۔ وہی کپڑے۔ وہی تراش۔ بلکہ انگریز درزی فیشن کے اعتبار سے مجھے زیادہ قدامت پسند اور روایت پرست نظر آئے۔ پھر ایک بیحد حسین اور دلکش انگریز لڑکی نظر آئی۔ بالکل بلانڈ۔

بالکل میدہ۔ اور شہاب۔ بلکہ شہد اور گلاب۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برف سے کاٹ کر بنائی گئی ہے اور رخساروں میں کسی چینی مصور نے رنگ بھرا ہے۔ میں مبہوت ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ مجھے دیکھ کر ذرا سی مسکرائی اور پھر آگے کو چل دی۔ میں بھی دُم ہلاتا ہوا اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ مگر ذرا فاصلے پر۔ کیونکہ نووارد تھا۔ دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ جی چاہتا تھا آگے بڑھ جاؤں اور اُس سے ہم کلام ہو جاؤں۔ کوئی ایک سو گز کے فاصلے تک ہم یوں ہی چلتے رہے۔ وہ آگے آگے۔ میں اس کے پیچھے پیچھے۔ اُس نے ایک بار بھی پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ نہ چور نگاہیوں سے جھانکا۔ گرینڈ سنیما کے قریب پہنچ کر وہ رُک گئی۔ اور میں ایک قد آدم آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے لگا۔ میرا سوٹ بہت عمدہ تھا اور سو فیصدی انگریزی۔ جیب میں پیسے بھی تھے۔ اور شکل و صورت بھی بُری نہ تھی۔ اس لئے...؟

اتنے میں ایک حبشی لمبا تڑنگا اور چوڑے سینے والا ہنستا ہوا آیا۔ اُس کی بغل میں ایک لڑکی تھی۔ وہ میری بلانڈ کے قریب آ کے ٹھٹکا۔ مسکرایا اور پھر اُس نے اپنا دوسرا ہاتھ آگے بڑھایا۔ بلانڈ اُس حبشی کی بغل میں آ گئی۔ اب وہ دائیں بائیں دو انگریز لڑکیاں سنبھالے ہوئے تھا اور میں حیرت سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حبشی مجھے دیکھ کر زور سے ہنسا۔ اور بغل میں دونوں لڑکیوں کو داب کر پکڈلی کی طرف چلا گیا۔

میں گھوم کر فٹ پاتھ کے قریب بیٹھے ہوئے اخبار بیچنے والے کی طرف متوجہ ہو گیا بلکہ اس طرح منہمک ہو گیا، گویا میری نگاہ میں بچے ہوئے اخبار اُس لڑکی سے کہیں زیادہ دلکش تھے۔ میرا چہرہ غصہ اور شرم سے تمتما رہا تھا۔ اور ایسا لگتا تھا۔ گویا حلق میں تھوک کے بجائے خون کے گھونٹ اُتر رہے ہیں۔ میں نے آبزرور خریدا۔ جسے میں صبح پڑھ چکا تھا۔ اور پھر گرینڈ سنیما کی تصویروں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ گرینڈ میں پکاسو کے آرٹ سے متعلق کوئی فلم چل رہی تھی اور میں پکاسو کا پرستار تھا۔ مگر وہ تینوں تو پکڈلی کی طرف گئے تھے۔ تو پکاسو کہ پکڈلی؟... پکڈلی کہ پکاسو؟

پھر قدم خود بخود پکڈلی کی طرف مُڑ گئے۔

وہ تینوں آگے جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک جگہ گھڑیوں کی دوکان کے باہر ایک انگریز بھکاری کھڑا تھا۔ حبشی نے اُسے ایک سکہ دیا۔ پھر جب میں وہاں پہنچا تو میں نے بھی اُس بڈھے انگریز بھکاری کو ایک سکہ دیا۔ ایک عجیب سی مسرت محسوس ہوئی۔ جیسے ٹیپو سلطان، سراج الدولہ اور ٹانا فرنویس کا سارہ قرضہ ایک ہی سکہ میں پٹا دیا۔

ہولے ہولے چلتا رہا اور آگے بڑھتا رہا۔ اور اپنے سے آگے بڑھ جانے والے اُن تینوں کو دیکھتا رہا۔ وہ دونوں انگریز لڑکیاں دائیں بائیں اُس حبشی سے چمٹ رہی تھیں۔

یہ منظر لندن کے لئے نیا نہیں ہے۔ لیکن آج تک کسی انگریز ادیب میں اسے بیان کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

راستے میں جوتوں کی دوکانیں بہت عمدہ تھیں۔ انگریز جوتے بہت عمدہ بناتے ہیں۔ بے حد بڑھیا اور دلکش اسٹائل والے، انگریز کے جوتوں، اور انشائیوں میں اس قوم کا اصلی رنگ جھلکتا ہے۔ ایک جوتا ضرور خریدنا پڑے گا۔ مگر اس وقت نہیں۔ دیکھوں یہ تینوں جاتے کہاں ہیں؟

پکڈلی سرکس میں پہنچکر وہ تینوں بائیں طرف کو مُڑ گئے۔ اور زمین دوز ٹیوب کے ریلوے اسٹیشن کے اندر چلے گئے۔

خدا حافظ میری بلانڈ۔ زندہ باد افریقہ!

پکڈلی سرکس اتنا بڑا ہے جتنا بمبئی کا کھڑا پارسی چوک، دادر کا خدا داد سرکل کا چوک بھی اُس سے ڈگنا ہوگا۔ تو یہ ہے مشہور و معروف پکڈلی!؟ یہاں سے بہت سی گلیاں پھوٹتی ہیں۔ کچھ سو ہو کو بھی جاتی ہیں۔ ایک بار خیال آیا۔ چلو چل کر سیر کریں۔ سو ہو کی فاحشاؤں کا نظارہ کریں۔ اور کسی اطالوی ریستوراں میں چل کر کھانا کھائیں۔ پھر دل نہ مانا۔ دل کچھ عجیب طریقے سے اُداس سا ہو گیا تھا۔ میں پکڈلی سرکس کا چکر لگانے لگا۔ تھیٹروں اور ہوٹلوں پر نیان روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ شام گہری ہو چلی تھی۔ گھر یاد آ رہا تھا۔ پنواڑی کی دوکان یاد آ رہی تھی۔ مگھئی پانوں کے نازک نازک سے دلنواز پتے، دل کی شکل کے۔ اور عورتیں گہرے رنگ کی ساڑھیاں پہنے ہوئے، جوڑے میں جوہی

کے پھول سجائے ہوئے اور کیلے کے پتوں پر سنہری گنڈیریاں رکھے ہوئے۔ اُن پر گلاب جل چھڑکتا ہوا گنڈیری فروش۔ بہت چھوٹی چھوٹی سی یادیں۔ ننھی ننھی کونپلوں کی طرح اُبھرنے لگیں۔ شاید وہ خط لکھ رہی ہوگی مجھے۔ یا اس وقت میرا خط پڑھ رہی ہوگی۔ کیا میری سانولی کو معلوم ہے کہ ابھی میں نے آکسفورڈ اسٹریٹ سے پکڈلی تک اُس سے کیسی بے وفائی کی ہے۔

چلتے چلتے میں ایک تھیٹر کے باہر رُک گیا۔ یہاں بیکٹ کا مشہور ڈرامہ "ویٹنگ فار گودو۔" (Waiting for godot) چل رہا تھا۔ اس تھیٹر کے بالکل سامنے سرکس کے دوسری طرف "ٹی ہاؤس آف آگسٹ مون"۔ (Tea house of August Moon) یہ دونوں ڈرامے میں دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر کب دیکھوں۔ آج یا کسی اور دن ...؟ پھر بائیں طرف نیان حروف میں جگمگاتا ہوا میں نے وہ نام پڑھا۔ "لندن فالیز" (London Follies) پیرس کی فالیز تو میں دیکھ چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ اُس کے مقابلے میں لندن کی فالیز کیا ہوں گی؟ مگر دیکھنے میں کیا حرج ہے؟

شاید اُسی بلانڈ کو دیکھنے کی خواہش تھی۔ جو مجھے لاشعوری طور پر کھینچ کر لندن فالیز میں لے گئی۔ ٹکٹ گھر سے میں نے ٹکٹ خریدا اور نیچے تھیٹر میں چلا گیا۔

یہ تھیٹر ایک چھوٹے سے تہہ خانے کی صورت میں تھا۔ (Basement) میں تو سے آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ شو شروع ہو چکا تھا۔ صرف دو سیٹیں خالی تھیں اور وہ بھی کوئی خاص آرام دہ نہ تھیں۔ میں ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سارا ہال تمباکو کے گہرے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ سامنے اونچے اسٹیج پر عریاں اور نیم عریاں لڑکیاں ناچ رہی تھیں۔ تماشائیوں میں عورت ایک بھی نہ تھی۔ زیادہ تر ملاح تھے۔ اور سیاح اور ادھیڑ عمر کے انگریز جو بار بار رومال نکال کر اپنا پسینہ پونچھتے جاتے تھے۔ اسٹیج سے زیادہ دلکش منظر اُن چہروں پر نظر آرہا تھا۔ جو عریاں ڈانس دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ رنگارنگ روشنیاں اسٹیج پر پڑ رہی تھیں، اور رنگارنگ کیفیتیں تماشائیوں کے چہروں سے ہویدا تھیں۔ ہائے یہ مفلس خواہش۔ یہ خاقہ زدہ آرزوئیں۔ یہ بھیک منگے رنگ، یہ

فریب خوردہ آسودگیاں کیا معلوم یہاں پر کون تماشا ہے اور کون تماشائی ہے۔۔۔!

میرے آگے بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ عمر کے انگریز نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"وہ سب سے اچھی لڑکی ہے"

"وہ کون؟"

"وہ میبل۔۔۔۔ سب سے بیچ والی"۔

میبل جو مرکز میں تھی۔ واقعی سب سے حسین تھی۔ یونانی زہرہ کا سا جسم۔ گویا شفاف بلور میں ڈھلا ہوا ہر عضو متناسب۔ ہر ادا مصرعہ اٹھاتی ہوئی۔ بدلتی ہوئی روشنیوں کے ہالے میں کبھی تو اس کا جسم برف میں ڈھل جاتا۔ کبھی شعلے کی طرح لپک جاتا۔ اس کے ارد گرد کی سب لڑکیاں ننگی تھیں۔ اور اپنی اپنی جگہ روکی ہوئی تھیں۔ صرف مرکز میں میبل ڈانس کر رہی تھی اور اُس نے اپنی بانہوں میں شترمرغ کے پر کے دو بڑے بڑے چھلکے اُٹھا رکھے تھے۔ جن سے وہ اپنے آگے پیچھے ستر پوشی کا کام لیتی تھی ڈانس کی دھن لمحہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اور تماشائیوں کا اشتیاق اُسے مکمل طور پر ننگا دیکھنے کیلئے بڑھتا جا رہا تھا۔

"واقعی وہ بہت خوبصورت ہے۔" ادھیڑ عمر کے انگریز کے ساتھی نے اُس سے کہا۔ "مگر تم میبل کو کیسے جانتے ہو؟"

وہ ادھیڑ عمر کا انگریز بڑے فخریہ لہجہ میں بولا۔ "یہ لڑکی ہمارے علاقہ میں رہتی ہے کلے برن اسٹریٹ میں۔ بیچارہ وہ سب سے اچھی لڑکی ہے لندن فالیز میں۔"

"شش! چپ رہو۔" قریب سے ایک ملاح گھونسہ دکھا کر بولا۔ ادھیڑ عمر کا انگریز سہم کر چپ ہو گیا۔

اتنے میں اندھیرے میں لڑکھڑاتا ہوا، ٹھوکریں کھاتا ہوا ایک بہت ہی بڈھا انگریز داخل ہوا اور ٹٹول ٹٹول کر اُس طرف بڑھنے لگا، جہاں میرے ساتھ کی ایک سیٹ خالی تھی میں نے اُٹھ کر اُس کا ہاتھ پکڑا۔ اور اُسے اپنے ساتھ کی سیٹ پر بٹھالیا۔ وہ بڈھا ہانپ رہا تھا اور اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"میرے بیٹے۔ میرے بیٹے!" بڈھا مینڈک کی سی پھٹی ہوئی آواز میں بولا۔

"میں میبل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا میبل اسٹیج پر ہے؟"

"کیا تم اُسے نہیں دیکھ سکتے بزرگوار؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"نہیں بیٹے میں اندھا ہوں۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"تو پھر تم یہ تماشا کیوں دیکھنے آئے ہو؟"

"میں کوئی تماشا نہیں دیکھنے آیا بیٹے! میں میبل کا دادا میبل کو یہ بتانے آیا ہوں کہ وِلی مر چکا ہے۔"

"وِلی کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میبل کا بیٹا ہے۔ چار سال کا۔ کئی دن سے وہ نمونیا سے بیمار تھا۔ میبل کو چھٹی نہیں ملی۔ وہ کہتی تھی اگر میں چھٹی لے لوں گی تو ملازمت سے برطرف کر دی جاؤں گی۔ اور گھر کو میبل ہی چلاتی ہے۔ اُس کا باپ مر چکا ہے اور شوہر بھی اور ماں اودھر رنگ سے لمبی پڑی ہے پلنگ پر برسوں سے۔ اور میں پچاسی برس کا اندھا ہوں۔... میرے بیٹے... میں میبل کو بتانا چاہتا ہوں کہ وہ ناچ بند کر دے اور گھر جائے۔ جہاں اُس کے بیٹے وِلی کی لاش رکھی ہے۔ میں مینیجر کے پاس گیا تھا۔ مگر اُس نے مجھے میبل سے ملنے نہیں دیا..."

"شش! آس پاس کے بہت سے لوگ چلائے۔ وہ یقیناً برافروختہ تھے۔ کیونکہ اس وقت ناچ اُس مقام پر پہنچ رہا تھا جہاں چند لمحوں کے لئے میبل اپنی بانہوں میں اُٹھائے ہوئے شتر مرغ کے دونوں پنکھے پھینک دے گی اور بالکل عریاں ہو جائے گی۔

"میبل!" بڈھا اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوا غرایا۔

"چپ رہو!" اُس کے پیچھے بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے دھمکی آمیز لہجہ میں اُس سے کہا۔

بڈھے کو غصہ آ گیا۔ وہ اپنی سیٹ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر کہنے لگا۔ "میبل!... میبل!... وِلی مر گیا ہے... وِلی مر چکا ہے... Willie is dead

یکایک اسٹیج پر ناچتی ہوئی لڑکی نے اختتامیہ موسیقی کے درمیان شتر مرغ کے

دونوں پنکھے چھوڑ دیے۔۔۔ اور۔۔۔ ننگی ہو گئی۔ پھر پُر شور تالیوں کے درمیان اسٹیج پر اندھیرا چھا گیا۔

پھر اُس گہرے اندھیرے اور سناٹے کے وقفے میں اسٹیج پر ایک عورت کے رونے کی دبی دبی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ پھر ایسا محسوس ہوا جیسے ایک سے زیادہ عورتیں اُس اسٹیج پر رو رہی ہیں۔ پھر جیسے سارے لندن کی عورتیں رو رہی ہیں۔

جس وقت میں اُس گھٹی گھٹی سیلی ہوئی تاریکی میں اُس پچاسی برس کے بوڑھے انگریز کو سہارا دے کر ہال کے باہر لے جا رہا تھا، مجھے ایسا لگا جیسے یہ انگریزی ادیبوں کا لندن نہیں ہے۔ لاہور ہے... دِلّی ہے... بمبئی ہے۔۔۔ اپنی ہی طرف کا کوئی شہر ہے یا گاؤں ہے جہاں دُکھ اور درد کے مارے مجبور انسان رہتے ہیں۔

اُس دن سے لندن میرے لئے اجنبی نہیں رہا۔ اُس دن سے میں لندن سے پیار کرتا ہوں۔

لندن کی دوسری شام

لندن کی ٹیٹ گیلری میں تصاویر اور اصنام کا وہ خزانہ تو نہیں ہے جو لینن گراڈ کے آرمی تاج (Hermitage) محل میں یا پیرس کے لودو میں ہے لیکن اپنی جگہ پر لندن کی ٹیٹ گیلری بہت عمدہ ہے۔ اور یہ گیلری اپنے اندر مصوری اور مجسمہ سازی کے نادر نمونے اور ہیرے جواہرات سے بھی بیش قیمت خزینے رکھتی ہے۔۔۔ بڑی دیر تک روداں کے مجسمے دیکھتا رہا۔ جن کی زمانے بھر میں دھوم ہے اور جن کی روز افزوں مقبولیت کو محسوس کر کے روداں کو اپنے مجسموں سے حسد پیدا کر دیا تھا۔ کیا خالق کو بھی اپنی تخلیق سے حسد پیدا ہو سکتا ہے؟... ممکن تو ہے... اس لئے کہ تخلیق کر دینے کے بعد تخلیق کی ہستی خالق سے الگ ہو جاتی ہے۔ اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ فطرت نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔۔۔ آزاد بھی اور خلاق بھی۔۔۔ ورنہ روداں کے یہ مجسمے کیسے ظہور میں آئے؟ جن کا جواب فطرت میں کہیں نہیں ملتا۔ جو فطرت پر اضافہ ہیں اور بالکل دوسری طرح کی ہی فطرت کو ظاہر کرتے ہیں۔ جو اگر انسان نہ ہوتا تو کسی طرح ظہور میں نہیں آسکتی تھی۔

روداں کے مجسمے دیکھ کر عظمتِ آدم کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ٹیٹ گیلری میں ایک دیوار کے سامنے لمبا کیو (Queue) لگا ہوا تھا دیوار پر ایک چھوٹی سی تصویر آویزاں تھی۔ جو اتنی دور سے نظر نہیں آتی تھی۔ ایک تصویر کو دیکھنے کے لئے اتنا لمبا کیو میں نے دنیا میں کہیں نہیں دیکھا۔ میں بھی کیو میں شامل ہو گیا۔ لمبا ہونے کے باوجود یہ کیو

انتہائی صابر لوگوں کا کیو تھا۔ یہ لوگ اس تصویر کو دو منٹ، تین منٹ، کوئی پانچ منٹ، کوئی سات منٹ آٹھ منٹ تک بھی کھڑے ہو کر دیکھتا تھا۔ مگر اس عرصے میں کیو کے تمام افراد انتہائی خاموشی سے کھڑے رہتے تھے۔ اور اپنی باری کا انتظار کرتے تھے۔

وان گو کی تصویر تھی۔ "کرسی"۔۔۔ مشہور عالم تصویر! میں نے مغربی آرٹ کے مختلف کتابی البموں میں یہ تصویر دیکھی ہے۔ مگر اصل اور نقل کا فرق آج ہی معلوم ہوا ... یوں تو کچھ نہیں تھا اس تصویر میں۔۔۔ سیٹ متواتر بیٹھنے سے پچک گئی تھی۔ کوئی بیش قیمت کرسی نہیں تھی۔ معمولی لکڑی کی نہایت ہی معمولی کرسی تھی، ایک عجیب زاویے سے زمین پر ٹکی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ابھی ابھی کوئی اس کرسی سے اُٹھ کر گیا ہے۔ سیٹ ابھی تک گرم ہو گی۔ صرف اتنا ہی نہیں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی ابھی اس کرسی سے اُٹھ کر گیا ہے۔ بلکہ کچھ کچھ جانے والے کے کردار، اُس کی شکل و صورت کا بھی اندازہ ہوتا تھا۔۔۔ عجیب طریقے سے یہ کرسی جانے والے کے کردار اور اُس کے خدوخال کی سمت ہمارا ذہن دوڑا دیتی تھی۔ ایک بڈھا سا آدمی تھا۔ پائپ پیتا تھا۔ گٹھیا کا مریض تھا۔ چلتا تھا تو اُس کے گھٹنے آپس میں ٹکرا جاتے تھے۔ رعشہ زدہ ہاتھوں سے وہ جلتی ہوئی ماچس کو اپنے پائپ پر رکھ رہا تھا۔ وہ اس تصویر میں نہ تھا۔ مگر میں اُسے اس کرسی سے اُٹھ کر جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں پچھتر سالہ زندگی کا سارا درد اور کرب پنہاں تھا۔۔۔ کتنا کچھ یہ ایک چھوٹی سی کرسی بتاتی ہے۔ کیسی خیال انگیز جادو کی کرسی وان گو نے بنائی ہے محض ایک تصویر ہے۔ مگر اپنے بطن میں ٹیٹ گیلری سے وسیع تر ایک تصویر خانہ سجائے ہوئے ہے۔ یہ کرسی کسی کو کچھ دکھاتی ہے، کسی کو کچھ کسی کو اپنے بوڑھے باپ کی تصویر دکھاتی ہے کسی کو اپنے دادا کی۔ کوئی اپنی مرحوم نانی کو تصور کر لیتا ہے۔ اس تصویر کے سامنے منٹوں نہیں گھنٹوں کھڑا رہا جا سکتا ہے۔ مگر کیو لمبا ہے۔ مجھے بھی اس بڈھے کی طرح اُس کرسی پر ایک نگاہ ڈال کر چل دینا چاہئے۔

میں آگے بڑھ گیا۔

"کیا ہے جی اس تصویر میں؟ ایک کرسی ہی تو ہے۔۔۔!" میرے پیچھے سے آواز آئی۔ میں نے مُڑ کر دیکھا۔۔۔ ایک دُبلا پتلا ہندوستانی سر پر فیروزی رنگ کی پگڑی باندھے کوٹ پتلون میں کھڑا تھا۔ اور آزردہ نگاہوں سے کبھی میری طرف کبھی اُس تصویر کو دیکھ لیتا تھا۔

میں نے اُسے اپنے پاس اشارے سے بُلایا اور اُسے لے کر برآمدے میں باہر چلا گیا

باہر جا کر میں نے پوچھا۔۔۔ "نہیں پسند آئی"

وہ بولا۔ "ہے کیا اس میں جی؟ کھالی ایک کرسی تو ہے۔ کھتی نوٹی کرسی! بے بھجول میں کیو میں کھڑا ہو گیا۔"

اُس کے کپڑے کوئی قیمتی نہ تھے۔ بلکہ بہت معمولی کہنا چاہئے بات چیت سے بھی ذرا اکھڑ اور گنوار معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا۔

"تو آپ ٹیٹ گیلری میں کیوں آئے؟"

"ٹاٹ گیلری؟" اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں"

"ہوا ایسا جی کہ میں اِدھر سے گزر رہا تھا کہ بلڈنگ کو دیکھ کے میں نے ایک گورے سے پوچھا۔ "واٹ از دِس؟" وہ بولا۔ "ٹاٹ گیلری!" میں نے سمجھا۔ کوئی ٹاٹ کی دوکان ہے۔ مجھ کو اپنے گھر کے لئے جو برمنگھم میں ہے۔ آٹھ فٹ چوڑا اور بارہ فٹ لمبا ٹاٹ کا ایک ٹکڑا چاہئے۔ تو باد شاہو! میں چلا اندر ٹاٹ گیلری میں ٹاٹ خریدنے!"

اتنا کہہ کر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ اور میرے ہاتھ پر ہاتھ مار نے لگا تو میں بھی اُس کے ساتھ ہنسی میں شامل ہو گیا۔ اور ہم دوست بن گئے۔ ہم لوگوں نے ایک دوکان سے پاپ کارن (Pop corn) مکئی کے بُھنے ہوئے دانے خریدے اور اُنہیں کھاتے ہوئے ٹریفلگر سکوئر آئے۔ اور باتیں کرتے کرتے ٹریفلگر سکوئر کے کبوتروں کو پاپ کارن ڈالنے لگے۔ بنتا سنگھ مجھ سے پوچھنے لگا۔ (یہی اس کا نام تھا)

"یہ انگریزی بھی بڑی بے وقوفوں کی زبان ہے۔ مکئی کو پاپ کارن بولتے ہیں۔

اجی اسمیں کیا پاپ ہے۔ اور کس کارن؟"

میں نے کہا۔۔۔ "اس میں کوئی شبہ نہیں، بڑی بے وقوف قوم ہے۔"

"اجی بے وقوف نہ ہوتی تو ہم لدھیانے سے آ کے اِدھر اتنا پیسہ کیسے کماتے؟"

وہ لدھیانے کو بڑے مزے سے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے لدھیانہ کہتا تھا اور جب وہ لدھیانہ کو لدھ۔ دھیانہ کہتا تھا تو مجھے بڑا پیارا معلوم ہوتا تھا۔

"تم مہینے میں کتنا کما لیتے ہو؟"

"کبھی تیس پونڈ ہو جاتا ہے جی کبھی چالیس پونڈ، کبھی پچاس پونڈ۔ بڑی ٹکڑی کمائی ہے اس دیس میں!۔"

"کیا کام کرتے ہو؟"

"جوتش لگاتے ہیں۔"

"جوتش؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟" وہ میرا حیرت زدہ چہرہ دیکھ کر مسکراتے ہوئے اور اپنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے بولا۔ "یہ انگریج لوگ اوپر سے کچھ بھی بولیں، اندر سے جوتش بدیا پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں کھاس طور پر اُن کی جنانیاں (عورتیں) تو بہت بھروسہ کرتی ہیں۔"

"تم نے جوتش بدیا کہاں سیکھی؟"

"کہیں نہیں!" بنتا سنگھ کی آنکھیں شوخی اور شرارت سے چمکنے لگیں۔ "سیکھی ہی نہیں"

"تو پھر؟"

"بس ایسے ہی اٹکل سے کام چلاتے ہیں۔" اس کے بعد اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی جیب میں ڈال لئے اور میری طرف کڑی نظروں سے دیکھ کر کہنے لگا۔

"سر میڈم بلڈی بیسٹ اسٹرالوجر۔ پاسٹ پریزنیٹ آل فیوچر ٹولڈ ہینڈز اَپ۔"

(Sir Madam Bloody Best Astrologer Past Present all Future told.Hands Up.)

"یہ ہینڈز اپ کیسے بھائی"؟ مجھے پوچھنا ہی پڑا۔

"مطلب یہ ہے کہ ہاتھ دکھاؤ۔" بنتا سنگھ نے مجھے سمجھایا۔

ہینڈز اپ کا یہ ترجمہ! میں ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔ بنتا سنگھ اپنی کارگزاری پر بہت خوش ہوا اور میرے اصرار کرنے پر اس نے انتہائی سنجیدہ لہجہ میں پھر اسے دوہرایا۔

"سار میڈم بلڈی بیسٹ اسٹرولوجر۔ پاسٹ پریزینٹ آل فیوچر نولڈ ہینڈز اپ۔"

میں نے پوچھا۔ "اس کے بعد وہ تمہیں ہاتھ دیکھنے دیتے ہیں؟"

"کوئی کوئی گورا صاحب مان جاتا ہے اور ہاتھ دکھا دیتا ہے۔ اکثر گورا صاحب دھکا دیکر نکال دیتا ہے میم صاحب اکیلا مل جائے تو ضرور ہاتھ دکھاتا ہے۔ اوپر سے ایک دو پونڈ بھی دے دیتا ہے۔ مگر بر منگھم شہر کا لوگ اپنے لدھیانہ کی طرح بہت چالاک ہوتا ہے۔ اس لئے ہم گاؤں میں جاتا ہے۔ ایک دفعہ بہت عجیب اکسی ڈنٹ ہوا جی! وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"کیا؟"

"ہم پیدل جا رہا تھا کشتواڑ کو بر منگھم سے۔"

"کشتواڑ؟" میں نے ٹوک کر پوچھا۔ "کشتواڑ تو جموں کے قریب ہے۔"

"جی نہیں کشٹر فارٹ۔" بنتا سنگھ نے معاملے کو صاف کرنے کی کوشش کی۔

کافی دیر کی بحث بحثی سے معلوم ہوا کہ اس کا اشارہ کاسٹر فورڈ کی طرف تھا۔

"ہاں تو پھر کیا ہوا!" میں نے پوچھا۔

"پانچ مائل کے بعد کھیتوں میں پہنچ گیا۔ سامنے سڑک پر ایک گھوڑا گڈی آ رہی تھی۔ جس کو ایک انگریج جٹ چلا رہا تھا۔ جب وہ میرے قریب آنے لگا۔ تو میں نے ہاتھ کے اسارے سے گھوڑا گڈی کو روک کے اس جاٹ سے کہا۔" سار میڈم بلڈی بیسٹ اسٹرالوجر پاسٹ پریزینٹ آل فیوچر نولڈ ہینڈز اپ۔" ہینڈز اپ سنتے ہی اس نے اپنی جیب سے اپنا بٹوہ نکال کے میری طرف پھینک دیا۔ اور خود گھوڑا گڈی چلا کے جلدی سے بھاگ گیا۔"

"ایسا کیوں ہوا جی؟" بنتا سنگھ نے مجھ سے پوچھا۔

"ہینڈز اپ آپ اُس وقت کہتے ہیں جب آپ کے ہاتھ میں یا جیب میں ریوالور ہو۔"

میں نے اُسے سمجھایا۔ اور پھر پوچھا۔ "تو پھر کیا تم نے وہ بٹوہ رکھ لیا؟"

"نہیں جی۔ میں نے کشتواڑ پہنچ کر بٹوہ گورے صاحب کی گھر والی کو دے دیا۔ ہم بلڈی بیسٹ اسٹرالوجر ہے۔ کوئی چور نہیں ہے۔"

مجھے سیدھے سادے بنتا سنگھ پر بہت رشک آیا۔ میں نے پھر پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

وہ بولا۔ "میڈم نے ہم کو ہاتھ دکھایا۔ بوہت خوش ہوئی۔ پانچ پونڈ انعام میں دیا۔"

وہ کبوتروں کو دانہ ڈالنے لگا۔ دو مہکتی ہوئی لڑکیاں ہمارے قریب سے گزر گئیں لیونڈر کے پھولوں کی طرح کھلی ہوئی۔ میں انہیں دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا

"تمہاری گھر والی کہاں ہے؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"اندر کور۔؟ اندر کور تو لدھیانے میں ہے۔" اُس نے ایسی لگاوٹ سے کہا۔ جیسے اندر کور میری بھی کوئی رشتہ دار ہے۔

"تو گھر گئے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا؟"

"چار سال سے جیادہ ٹیم ہو گیا۔ جب سے آیا نہیں گیا۔ وہ کسی قدر اُداسی سے بولا۔

"پھر کیا کرتے ہو" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ کچھ نہیں جی۔ بس ایسے ہی ڈارلنگ پھارلنگ سے کام چلاتے ہیں"

میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ پھر ہم دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر زور زور سے ہنسنے لگے۔ اُس کا ڈارلنگ پھارلنگ مجھے بہت پسند آیا۔ کیونکہ آجکل کی محبت ایسی ہی تھی۔ ڈارلنگ پھارلنگ۔ عاشق فاشق، شادی وادی۔ بلکہ شادی کم اور وادی زیادہ۔ عاشق کم اور فاشق زیادہ۔ ڈارلنگ کم پھارلنگ زیادہ عجیب زندگی ہوتی جا رہی ہے۔

وہ میری طرف جھک کر انتہائی رازداری میں کہنے لگا۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ اپنا دھندا بڈھی عورتوں اور ادھیڑ عورتوں پر چلتا ہے۔ ہم تو گھروں میں اُسی وقت جاتے

ہیں، جب گورا صاحب گھر پر نہیں ہوتا۔ تب میم صاحب بہت کھسی سے ہاتھ دکھاتا ہے۔ اور... اور..." وہ میری طرف دیکھ کر آنکھ مارتے ہوئے بولا۔ اور پیسہ بھی اچھا دیتا ہے۔"

"کیا اُدھر لدھیانے میں تم یہیں کام کرتے تھے؟"

"جی نہیں۔ ہم تو جاٹ ہے کھیتی باڑی کرتا ہے۔ مگر ایسا ہے جی کہ دو لڑکیوں کی شادی میں بہت پیسہ نکل گیا۔ اُدھر میرے بیٹے سرب جیت کو ڈاکٹری پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اُس کو ڈاکٹری میں ڈالا۔ مگر ڈاکٹری کا کھرچہ بہت ہے۔ اس لئے ہم لندن آگیا۔ اور یہ دھندا کرنے لگا۔ ہم جیادہ کر کے باہر گھومتا ہے۔ صرف کرسمس کے دنوں میں لندن آتا ہے۔ اور جو پیسہ کماتا ہے، گھر بھیج دیتا ہے۔ ایک سال بعد سرب جیت ڈاکٹری پاس کر جائے گا۔ واہ گرو کی کرپا سے۔ پھر ہم واپس چلا جائے گا اپنے وطن کو۔ یہاں دل نہیں لگتا ہے۔"

یکایک وہ چپ ہو گیا۔ اُس کی تھیلی سے پاپ کارن کے سارے دانے نکل کر نیچے کبوتروں میں جا پڑے پھر بھی وہ خالی تھیلی ہاتھ میں لئے لئے کہیں دور پہنچ گیا۔ جہاں سرسوں کے پیلے پیلے کھیتوں میں اُس کی اندر کور کھڑی اُسے نہار رہی تھی۔ وہ اپنی نیٹ گیلری میں مستغرق تھا۔ اور روداں سے بھی خوبصورت مجسمے اُس کی نگاہوں میں تھے۔ ہر انسان اپنے خیال کا مصور ہے۔ اپنے تصور کا صنم گر۔۔۔ سُنا ہے کبھی پرومتھیس (Prometheus) نے دیوتاؤں کی آگ چرائی تھی۔ اس کی پاداش میں اُسے زنجیر سے باندھ دیا گیا تھا۔ اور ہر روز اُسے گدھ نوچ کر کھاتا تھا۔ بنتا سنگھ بھی چار سال سے ایک زنجیر سے بندھا ہوا ہے۔ وہ بھی انگلستان میں آگ چرانے آیا ہے۔ جہاں بڈھی انگریز عورتیں ہر روز اُس کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتی ہیں۔

سر جھکائے وہ نیچے کبوتروں کو دیکھ رہا ہے۔ شاید وہ اس وقت اپنے گھر کی دہلیز پر پہنچ گیا ہے... اس لئے اس وقت میں نے وہاں سے ٹل جانا ہی مناسب سمجھا۔ چلتے چلتے میں نے اُسے الوداع کہی۔ مگر میرا خیال ہے۔ اُس نے میرا سلام بھی نہیں سُنا۔ ورنہ

پلٹ کر ضرور دیکھتا۔ میں خاموشی سے وہاں سے چلا آیا۔ اور وہ وہیں کبوتروں پر جھکا جھکا کچھ سوچتا رہا۔

چند دنوں کے بعد ریجنٹ میں ایک اطالوی فلم دیکھنے گیا۔ "دی کوٹ" بہت عمدہ اطالوی فلم تھی۔ نئی حقیقت نگاری کی طرز پر تو نہ تھی۔ ہاں اس کا پیش خیمہ ضرور تھی پکچر دیکھ کر جو باہر نکلا تو دوسرے شو کا کیو باہر کھڑا تھا۔ اس وقت زور کا جھکڑ چل رہا تھا۔ گو برف گر کے تھم گئی تھی۔ مگر ابھی سامنے سے ہٹائی نہ گئی تھی۔ اس برف پر دو انگریز بھکاری اپنی قمیض، کوٹ، پتلون اُتار کر صرف ایک چڈی پہنے ہوئے ایک دوسرے کے اوپر سرکس کے جوکروں کی طرح چھلانگیں مار رہے تھے اور پیسے مانگ رہے تھے۔

کیو کے دوسری طرف بنتا سنگھ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کیو کے ساتھ ساتھ بڑے کڑوے لہجہ میں کہہ رہا تھا۔

"سارمیڈم بلڈی بیسٹ اسڑالوجر۔ پاسٹ پریزینٹ آل فیوچر ز ٹولڈ۔۔۔ ہینڈز اَپ۔"

لندن کی تیسری شام

ہائیڈ پارک میں ایک میلا سا انگریز نیلا ٹوائڈ سوٹ پہنے لکڑی کے ایک میلے سے کھوکھے پر کھڑا ہو کر چلا رہا تھا۔

"پانچ پینی میں جنت لے لو۔

صرف پانچ پینی میں جنت۔"

اس کے ہاتھ میں بہت سے چار ورقی پمفلٹ۔ جن کی قیمت پانچ پینی تھی۔ اس پمفلٹ میں جنت حاصل کرنے کے بہت سے آسان اور مجرب نسخے درج تھے۔ جن کے سریع التاثیر ہونے کے ثبوت میں انجیل مقدس سے جگہ جگہ حوالے دیئے گئے تھے۔

ایک پمفلٹ میں نے لیا اور دوسرا ایک عورت نے۔ غصہ شاید زکام تھا اور جو شاید اپنا رومال گھر بھول آئی تھی۔ اتنا کہہ کر میں نے قادر یار کی طرف دیکھا۔

میری بات سن کر قادر یار بولا۔

"تمہارے ایسے انسان سنگسار کئے جانے قابل ہیں۔۔۔ اچھا بتاؤ ہائیڈ پارک میں اور کیا کیا دیکھا؟"

"وہاں ہائیڈ پارک میں ایک انگریز احمق سے میری لڑائی ہو گئی۔"

قادر یار نے پوچھا۔۔۔ "یہ احمق کیا بلا ہے؟"

میں نے کہا۔۔۔ "یہ احمق کی تانیث ہے۔۔۔ وہ عورت تھی نا!"

قادر یار نے میری صرف کڑی نظروں سے دیکھ کے کہا۔۔۔ "اچھا اب آپ کو

ہماری زبان میں اتنا دخل ہو گیا۔ کہ تذکیر و تانیث کے معاملہ میں بھی بولنے لگے۔"

میں نے کہا۔ "تم نے چلتے وقت کبھی یہ سوچا تھا کہ زبان کا کیا ہو گا؟"

وہ بولا۔۔۔ "وہ تو جب ہم تمہارے ہاں سے چلے تھے تو اپنی زبان کو رو آئے تھے۔"

"تو اب اعتراض کیوں کرتے ہو؟۔۔۔ اب آرام سے سنو اس انگریز احمق سے میری لڑائی کا حال۔!

"پہلے احمق، اب احمق"۔۔۔ قادر یار نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔۔۔ یا اللہ! اب اس زبان کا کیا ہو گا؟"

میں نے کہا۔۔۔ "ارے وہی ہو گا جو ہم چاہیں گے۔ تم بیچ میں بولنے والے کون ہوتے ہو؟"

"یہ بھی ٹھیک ہے" قادر یار نے دانت پیس کر لیکن سر جھکا کر کہا۔ "فرمایئے!"

میں نے کہا۔ "بڑی دبنگ عورت تھی۔ اس کے جبڑے گھوڑا مار کہ تھے۔ اور اس کی آواز نیچے سروں میں ایک پرانے ٹین کے ڈبے اور اونچے سروں میں ایک گیدڑ کی آواز سے مشابہ تھی۔ اس نے ایک ہاتھ میں کتے کا بنا ہوا۔ ایٹم بم اٹھا رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک بہت بڑا اسٹاپ کارڈ جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

"مجھے ایٹم بم چاہئے۔!"

"کیوں چاہئے؟" ایک صاحب نے اس عورت سے پوچھا۔

"کیوں کہ میں اس دنیا کو تباہ کر دینا چاہتی ہوں" وہ انگریز عورت شدید خفگی کے لہجہ میں بولی۔

"کیوں تباہ کرنا چاہتی ہو۔؟" دوسرے نے پوچھا۔

کیوں کہ مجھے انسان اور اس کی غلط تہذیب سے نفرت ہے

"مگر اب تو انسان نے خاصی ترقی کر لی ہے۔" ایک اور صاحب بولے۔

"کیونکہ معاملہ دلچسپ تھا اور اس انگریز عورت کے گرد بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔"

اب تو لندن کے قریب علاقوں یعنی ایسٹ اینڈ کے مزدور پیشہ لوگ بھی اپنے گھروں میں ٹیلی ویژن سیٹ رکھنے لگے ہیں۔"

"مجھے ٹیلی ویژن سے نفرت ہے۔"

"میڈم۔۔۔۔" ایک انگریز جو اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتا تھا اسے یہ دعویٰ آسٹورڈی لہجہ میں بولا۔ "کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ یہ خوبصورت نظارے اور رنگین عورتوں سے بھری ہوئی دنیا ایٹم بم سے تباہ ہو جائے؟"

"مجھے ایٹم بم سے نفرت ہے۔" وہ انگریز عورت تیز لہجہ میں بولنے لگی۔ "یہ سب انسانوں کی دنیا میں غریبی، بھوک اور شور مچانے کے ہتھیار ہیں۔ اس سب کو جان سے مار دینا چاہئے۔"

وہ انگریز ہکا بکا سے رہ گیا۔ مگر آدمی شریف تھا۔ آگے کچھ نہیں بولا۔ اپنی سیٹ پر ذرا سا آگے کو جھکا کے چلا گیا۔

اب میں نے سوال کیا۔

"اس کام کے لئے آپ کو کتنے ایٹم بم چاہئیں؟"

وہ بولی۔۔۔ "صرف ایک۔۔۔ مگر اتنی بڑائی سے میں اس دنیا کو ایک ہی جھٹکے میں تباہ کر دوں گی۔"

میں نے کہا۔ "آپ کو تو صرف ایک ایٹم بم چاہئے۔ مجھے تین چاہئیں۔"

"تین کیوں؟" اس انگریز عورت نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔

میں نے کہا۔ "ایک تو دنیا کو ختم کرنے کے لئے اور دو آپ کو ختم کرنے کے لئے کیونکہ آپ جیسی عورت ایک ایٹم بم سے ختم نہیں ہو سکتی۔"

اس پر وہ گنجے کا پارہ اور ایٹم بم سے چھوٹے مجھے مارنے دوڑی۔ میں وہاں سے سرپٹ بھاگا۔ خوش قسمتی سے مجھے فوراً ہی دوسرے جانے والے ایئر بس مل گئی۔

میں اور میرے ساتھی قادریار سے وہ ایک یونانی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ اس میں دو پانچ کمرے تھے۔

کے سات آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ میرا قصہ سُن کے قادریار زور سے ہنسا تو ہمارے دائیں بازو کے ٹیبل پر زور سے ٹکرا کر ایک آدمی ہماری طرف گھور کر دیکھنے لگا۔ اُسے دیکھ کر قادریار نے فوراً اپنا قہقہہ ختم کر دیا۔

میں نے آہستہ سے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟"

وہ میری طرف جھک کر سرگوشی میں بولا۔ "یہ کیکو کیکیلیا کیکیلاڑ ہے۔"

میں جھوٹ نہیں بولتا کچھ ایسا ہی نام بتایا تھا اُس نے۔۔۔ یہ بھی بتایا کہ یہ قوی ہیکل آدمی ایک یونانی سمگلر ہے جو عرب ملکوں کو عورتیں سمگل کرتا ہے۔"

"عورتیں؟"

"ہاں!"

"مگر عورتیں کیوں؟"

"جب سے عرب ملکوں میں تیل دریافت ہوا ہے عرب شیوخ کے ہاں یورپی عورتوں کی کھپت بڑھ گئی ہے۔۔۔ ہر سال سینکڑوں سمگل کی جاتی ہیں۔ بڑا منافع بخش دھندا ہے۔"

"کیا اسی لئے تم یہاں آئے ہو؟"

"نہیں۔۔۔" اس ریستوران کا مالک ایک بہت عمدہ یونانی شراب تیار کرتا ہے۔ کالکار کریٹ۔۔۔ (کچھ ایسا ہی نام بتایا تھا اُس نے) بے حد سستی ہے مگر کیا زبردست کی شراب ہے۔ ابھی منگاتا ہوں اس کے ساتھ یہاں ایک خاص قسم کی روٹی ملتی ہے۔ جسے تیار کرنے کے بعد گرم گرم حلقوں میں فرائی کیا جاتا ہے۔ کچھ کچھ ہمارے پراٹھے سے ملتی جلتی ہے۔۔۔ اس روٹی کیساتھ یہاں ایک سوپ ملتا ہے روسی بورش سے ملتا جلتا ہے۔ مگر ایشیائی مصالحے ہوتے ہیں اس لئے مزے میں بورش سے بہتر ہے۔ مگر میں ذرا من موہن کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"من موہن کون ہے؟"

"ایک عجیب کردار ہے۔ لندن میں پی ایچ ڈی کرنے آیا تھا۔ پھر یہیں رہ گیا۔"

"کیا کرتا ہے؟"

"سوہنے ایک ہوٹل میں پلیٹیں دھوتا ہے۔۔۔ بڑے وہ آدمی ہے۔ تم اس سے مل کر لو وہ آگیا۔" قادر یار چلا کر بولا۔ "لمبی عمر ہوئی تمہاری" من موہن اردو تو بول رہے تھے۔"

مجھے من موہن سنگھ کا چہرہ شرمیلا اور ذہین معلوم ہوا۔ داڑھی بھی بڑی نرم اور گول سی، بڑی بڑی سُرمگیں آنکھیں، لمبی لمبی پلکوں میں چھپی ہوئی۔ جب پلکیں اٹھا کر دیکھتا تو عجیب بے خواب، گہری، سیاہ، تہی تھی، کتنی بڑی سات سی کائناتیں اُس کی ہوتی تھیں۔۔۔

غم زدہ سمندر کی سی آنکھیں جیسے شب و روز کے آنسوؤں سے۔۔۔ بار بار انھوں نے پلکیں گرانے کے بجائے اندر چوس لیا ہے۔۔۔ اُن آنکھوں میں دیکھنا بے حد تکلیف دہ تھا۔ اُس کے ساتھ ایک یونانی لڑکی تھی۔

"اس کا نام لیکی پارٹ ماکاس ہے۔" من موہن سنگھ نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

(دیکھ ایسا ہی نام بتایا تھا اُس نے سمجھ میں نہیں آتا یونانیوں کے نام اتنے ایسی، ویسی کیوں ہے۔۔۔ اُن نے ہاں کاف نے بغیر کوئی لفظ بولی نہیں ہوتا ہے!)

"مگر اس کا نام بہت لمبا ہے۔۔۔ اور کچھ گندہ سا بھی ہے۔ قادر یار ہنس پڑا۔۔۔

"ہائے اگر ہماری زبان میں کسی کو "تیری ماکاس"۔ کہا جائے تو کشت و خون ہو جائے۔"

"اسی لئے میں اسے صرف "فش" (Fish) کہتا ہوں۔" من موہن سنگھ نے جملہ مکمل کیا۔

فش یعنی مچھلی۔۔۔ وہ لڑکی بھی مچھلی کی طرح بدبودار تھی۔ اوپر نیچے ہونٹ پر مونچھیں تھیں اور سفید کے نیچے ٹانگوں پر جھورے جھورے بال تھے۔ دانت پیلے اور غیر متناسب تھے اور بال اُس نے سر پر بھڑ کے چھتے کی طرح پھیلا رکھے تھے۔

رنگ سفیدی اور زردی کے بیچ کا۔ جیسے کسی ناصاف پیٹ کا ہو۔۔۔

قادر یار نے پوچھا۔ "کیا یہ ہماری بولی سمجھتی ہے؟"

"نہیں۔۔۔" من موہن نے اقبال کیا "مگر میں نے اسے چند گالیاں سکھادی ہیں اور اب یہ بلا خوف و خطر کہہ سکتی ہے کہ میں ایشیائی زبانوں کی ماہر ہوں۔"

"چند گالیوں کی بنا پر۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔! گذشتہ چار سو سال میں ہم نے گالیوں کے سوا انسانی علوم میں اور کیا اضافہ کیا ہے۔؟ باقی سب کچھ تو یورپ کا ہے۔" من موہن نے اپنی لڑکی سے کہا۔

"اے فش! بیٹھ جا!"

"فش کرسی گھسیٹ کر میرے اور من موہن کے بیچ بیٹھ گئی۔ اُس کے جسم سے ایسی بو آرہی تھی، جیسے کسی پرانے برتن سے۔۔۔ من موہن میرے نتھنے کی پریشانی دیکھ کر ذرا سا ہنسا اور بولا۔۔۔ "یہ مہینے میں صرف ایک بار نہاتی ہے۔ کبھی تین تین مہینے نہیں نہاتی"

"کیوں۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"عورت مجھے ایسی ہی پسند آتی ہے۔ جیسی خدا نے اسے بنایا ہے۔"

میرے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا اور میں نے اُسے الگ سے ایک خانے میں رکھ دیا۔ "بعد میں پوچھوں گا۔"

پیتے پلاتے رہے۔ کچھ نقل بھکتے رہے کچھ ہنسی مذاق کرتے رہے۔ لڑکی اب پھیل کر بیٹھ گئی تھی اُس کی دونوں کہنیاں میز پر ٹکی تھیں۔ مذاق کرتے وقت وہ کبھی ایک کہنی مجھے مارتی تھی دوسری کہنی اپنے عاشق کو کبھی سامنے بیٹھے ہوئے قادر یار کو دیکھ کر اُس کی ناک پکڑ کر ذرا سا ہلا دیتی تھی۔ پیار میں، مگر وہ زیادہ گونگی سی بنی بیٹھی رہی۔ کیونکہ وہ ہماری زبان نہیں سمجھتی تھی۔ بس چپکے چپکے پیتی جاتی تھی اور باری باری ہم تینوں کو دیکھ کے ایک سمجھ دار ماں کی طرح مسکراتی جاتی تھی۔۔۔

"لندن میں تمہیں پلیٹیں دھونے سے بہتر کوئی نوکری نہیں ملتی۔؟" میں نے من موہن سے سوال کیا۔

"ملتی تو ہے مگر میں کرتا نہیں ہوں۔" وہ بولا۔

"کیوں۔۔۔؟"

"سبھی نوکریوں میں ایک طرح سے گندی پلیٹیں دھوئی جاتی ہیں۔ بی بی سی کا شاعر سنیما کا مسخرہ، دفتر کا کلرک، پارلیمنٹ کا ممبر، غور کرو تو یہ سب لوگ جو ٹھن دھوتے ہیں۔ تو میں سیدھا سیدھا وہی کام کیوں نہ کروں جسے دوسرے لوگ دوسرے نام سے کرتے ہیں۔"

میں نے قادر یار کی طرف دیکھا۔۔۔ قادر یار میری طرف دیکھ کے مسکرایا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ کیوں؟ میں نہ کہتا تھا۔ اپنا من موہن سنگھ اپنی طرز کا ایک ہی کیرکٹر ہے لندن میں!

"تو تم کو لندن میں کوئی خوبصورت عورت نہیں ملتی ہے۔ اپنا دوست بنانے کے لئے؟"

میں نے اُس سے دوسرا سوال کیا۔ ذرا اُسکی طرف جھک کر اور سرگوشی کے لہجہ میں۔!!

"ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" من موہن بولا۔ "میں تو ملے عام سب کے سامنے اس لڑکی کو بدصورت کہتا ہوں۔ اور بدصورتی تو گناہ نہیں ہے کوئی، بلکہ خوبصورتی ہے بھی!۔"

"وہ کیسے۔؟" میں نے پوچھا۔

"خوبصورتی دراصل بدصورتی کو چھپانے کی ناکام سی کوشش ہوتی ہے۔ تمام مفید اشیاء، رنگ اور روغن کے بغیر اپنے ٹھوس باطن میں بدصورت ہوتی ہیں خوبصورت سے خوبصورت عورت کی خوبصورتی بھی ایک انچ سے ہزارویں حصہ تک کم ہی ہوتی ہے اُس کے اندر تو سبھی عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ تمام [illegible] اور تو میں کے اندر بدصورتی کی قدر مشترک ہے اور وہ سچ پوچھئے تو ہے۔

"یا کسی خوبصورت عورت کو دیکھ کر تمہارا دل کا چنا نہیں ہے [illegible]

"کانپتا ہے۔ مگر بالکل کسی دوسری وجہ سے۔" وہ بولا۔ "میں سوچتا ہوں فطرت نے اس عورت کو خوبصورت بنا کر مجھ سے کس قدر چالاکی کی ہے۔ اُس کو عمدہ رنگت، نرمی، ملائمت، لچک اور گولائیاں دے کر مجھے کس قدر بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے۔ مگر میں بے وقوف بننے کا نہیں ہوں۔ مجھے پندرہ سال ہو گئے ہیں لندن میں رہتے ہوئے۔ میں آج تک کسی عورت کے دام میں نہیں آیا۔ میں صرف بدصورت عورتوں سے پیار کرتا ہوں۔ وہ اپنے دل کے اندر جانتی ہیں کہ وہ بدصورت ہیں۔ اس لئے اپنی کمی کو دوسرے طریقوں سے پورا کرتی ہیں۔ ذرا سوچو تو ایک خوبصورت عورت کے پیچھے کس قدر بھاگنا پڑتا ہے۔ کس قدر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ کیسی کیسی تلخ باتیں اس کی سہنا پڑتی ہیں۔ حالانکہ اپنی جلد کے اندر وہ عورت کسی طرح دوسری عورت سے مختلف نہیں ہوتی۔ بخلاف اس کے بدصورت عورت الٹا خوشامد کرتی ہے۔ ناز اُٹھاتی ہے۔ گالیاں، مار پیٹ سب سہہ کر بھی خدمت کرتی ہے۔ کسی خوبصورت عورت سے تو خدمت کرا کے دیکھو، دوسرے ہی دن کسی نئے عاشق کے ساتھ بھاگ جائے گی۔"

قادر یار ہنس کر بولا۔ "یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو، ایک دفعہ ۔" یکایک وہ چپ ہو گیا۔ مگر اُس کی آنکھیں کسی ایسے واقعہ کو یاد کر کے چمک رہی تھیں جس میں ضرور کسی خوبصورت عورت کی بے وفائی کی داستان پنہاں تھی۔

"جب میں نیا نیا لندن آیا تھا۔ تو میرے دل میں شام کی شفق، مرد کی محنت، عورت کے حسن کی بڑی وقعت تھی۔ مگر دھیرے دھیرے سب کچھ مٹ گیا۔ لندن ایک بہت بڑا ہے کارخانہ جس میں صرف گندی پلیٹیں دھوئی جاتی ہیں۔ یہاں حسن کا کوئی مصرف نہیں۔ البتہ بدصورتی کا ہے۔ جتنی زیادہ بدصورتی استعمال کریں گے۔ اتنے زیادہ آپ کامیاب ہوں گے۔ کیونکہ جس پلڑے میں ہم کھڑے ہیں اُس کے اندر رکھی ہوئی ہر چیز پیچھے جا رہی ہے۔ ہم لوگ ہاٹ نہیں ہیں، بکاؤ ہیں۔"

کہتے کہتے یکایک وہ رُک گیا۔ اُس کی نم دیدہ سمندر کی سی آنکھوں میں ہلچل سی

پیدا ہوئی اور غائب ہو گئی۔ پھر اُس نے عجیب حرکت کی۔

اس نے زور سے اپنی ہتھیلی پر تھوکا اور پھر ہتھیلی آگے بڑھا کر اپنی من سے بولا۔

"اسے چاٹو۔"

میں نے سمجھا۔ اب وہ میرے اُٹھ جائے گی۔ کیونکہ وہ خاصی مضبوط اور تگڑی لڑکی تھی اور اُٹھ کر من موہن سے کال پر زور کا ایک طمانچہ رسید کرے گی۔

مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ صرف چند لمحوں کے لئے جھجکی اور پھر اس نے من موہن کی ہتھیلی اپنے ہاتھ میں لے لی اور اُسے منہ تک لے جا کر چاٹنے لگی۔

میں بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا اور پھر جھونپڑی سے باہر جانے لگا مجھے اپنے پیچھے من موہن کی تلخ ہنسی سنائی دی۔ وہ قادر یار سے کہہ رہا تھا۔

"تمہارا دوست نمبر ون ایڈیٹ ہے۔ خطا تو کے کیوں جا رہا ہے۔ اُس سے پوچھو۔ یہاں من سے اس نے بات نہیں کی تھی۔ اور اس نے نہیں چاہا۔ اور اس نے نہیں دیکھا کہ میں کون ہے جو ایسا نہیں کرتا۔ ؟ مجھے اُس کا مرہتا دو۔ پھر میں پلیٹیں دھونا بند کر دوں گا۔"

میں [illegible]

وہ صرف [illegible] تھی۔ مجھے اب [illegible] طرف چلنا تھا [illegible] پلکوں [illegible] میں [illegible] اور [illegible] ہاتھ [illegible] آنے لگے۔ میں نے اپنے [illegible] سے [illegible] پھر میں [illegible] ہوئی [illegible] انگلیوں [illegible] میں [illegible] چاٹنے [illegible] میں [illegible] ایک [illegible] نہیں [illegible] میں [illegible]

یکایک مجھے [illegible] سے [illegible] ایک [illegible] باہر [illegible] نکل [illegible] ایک [illegible] میں [illegible]

کچھ ڈھونڈھ رہی تھی۔ جیسے وہ برف اور چاندی کو ملا کر بنائی گئی تھی۔ جیسے اُس کی آنکھوں میں بنفشے کے پھول کھلے ہوں۔ ایسی خوبصورت، مضطرب، کھلے کھلے ہونٹوں سے التجا کرنے والی وہ مجھے نظر آئی۔

میں ایک لمحہ کے لئے ٹھٹک گیا۔

"کیا کچھ کھو گیا ہے؟"

"پانچ پونڈ!"

اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور ایک معصوم بے بس سی التجا۔ میں نے سوچا اس لڑکی نے پانچ پونڈ کھو دیئے ہیں اور اب اس کو مل نہیں رہے ہیں اور برف گر رہی ہے اور رات گہری ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس حسین لڑکی کے لئے پانچ پونڈ کس قدر ضروری ہیں اگر اسے پانچ پونڈ نہ ملے تو اس کا شرابی باپ اسے پیٹے گا یا اس کی درزن ماں اسے چھڑی سے مارے گی۔

میں نے جیب سے نکال کر پانچ پونڈ اسے دیدیئے۔ اُس نے لے لئے کچھ کہے سنے بغیر۔ میں آگے بڑھ گیا۔

یکایک مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرے پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔ پھر وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی میرے ساتھ آ گئی۔ اور میری بانہہ میں اپنی بانہہ ڈال کر بڑے اطمینان سے بولی۔

"کہاں چلیں گے؟ میرے گھر یا آپ کے ہوٹل؟"

وہ من موہن سنگھ ٹھیک کہتا تھا۔

مگر برف اتنی کم کیوں گرتی ہے۔ اتنی کم کیوں گرتی ہے۔

یا اللہ ایک دفعہ تو اتنی برف گرا دے کہ ساری پلیٹیں ڈھک جائیں اور ساری ہتھیلیاں صاف ہو جائیں!!

لندن کی چوتھی شام

دوسرے مغربی شہروں کی طرح لندن میں بھی کپڑوں کی دھلائی کا مسئلہ بہت تکلیف دہ ہوتا جا رہا ہے۔ لانڈری کے دام اتنے بڑھ گئے ہیں کہ کسی میلی قمیض یا پاجامہ کو دھلانے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ آدمی نئی قمیض یا پاجامہ خرید لے۔ نائیلون اور نیری لین اور اسی قبیل کے دوسرے مصنوعی سوتوں کی ایجاد نے اس مسئلہ کو کسی حد تک حل کیا ہے۔ مگر اون اور روئی کے سوت کی دھلائی کا مسئلہ اسی طرح باقی ہے۔

گھر کی عورت کی بچت کا خیال رکھتے ہوئے اب لندن کے مختلف بازاروں اور گلیوں میں لانڈری کے بجائے چھوٹے چھوٹے لانڈریٹ کھل گئے ہیں جہاں کپڑا دھونے کی پندرہ بیس مشینیں نصب کر دی جاتی ہیں۔ ان مشینوں کا اوپر کا غلاف کانچ کا ہوتا ہے تاکہ آپ مشین کے اندر اپنا کپڑا اوٹھلتا ہوا دیکھ سکیں۔ عورتیں اپنے گھروں سے کپڑے کے بنڈل اٹھا لاتی ہیں اور ایک مناسب فیس ادا کر کے کپڑے مشین میں جھونک دیتی ہیں۔ اور پھر مزے سے اخبار پڑھتی رہتی ہیں۔ یا بنائی کرتی رہتی ہیں۔ مشین کپڑے دھو کر اگل دیتی ہے۔ عورتیں اس گیلے بنڈل کو اٹھا کر گھر لے جاتی ہیں اور سکھا کر استری کر لیتی ہیں۔

مجھے چونکہ لندن میں کافی عرصہ رہنا تھا اس لئے میری دوست حبیبہ نے مجھے لانڈریٹ کی ترکیب سمجھائی۔ اُس نے میرے اور اپنے کپڑوں کا ایک بنڈل بنایا اور مجھے اپنے ساتھ لانڈریٹ لے گئی۔ جہاں میں اپنے اُس کپڑوں کا بنڈل سوتے دیکھ کر

عجیب سا محسوس کرتا رہا۔

"سنو حبیبہ!" میں نے اُس سے کہا۔ "ساری زندگی تو ہم الگ الگ رہے۔ کپڑے الگ جنم الگ۔ خیال الگ۔ روحیں الگ۔ اس لئے اب لندن میں آ کر ایک ہی مشین میں اپنی قمیض اور تمہارے پاجامے کو گنڈمڈ ہوتے دیکھ کر عجیب سا لگتا ہے۔"

"وجہ انگریزی میں ایک محاورہ ہے۔" حبیبہ ہنس کر بولی۔ Washing dirty linens in public "وہ اس موقع پر صادق آتا ہے۔"

زیادہ باتیں کرنے کا یہاں موقع نہ تھا۔ کیونکہ لانڈریٹ میں ہر عورت کا منہ مشین کے سامنے بیٹھی ہوئی کسی اخبار یا رسالہ کے مطالعہ میں مصروف تھی۔ اس لئے حبیبہ کا قہقہہ بہت بے محل رہا اور میں بھی جلدی سے مسکرا کر چپ ہو گیا۔ کیونکہ باقی سبھی انگریز عورتیں تھیں اور اس طرح خاموش خشوع خضوع کئے بیٹھی تھیں گویا کسی کار خیر میں مصروف ہوں۔ ایسے مقدس ماحول کو درہم برہم کرنا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ اور حبیبہ سے کہا۔

"تمہیں تو یہاں وقت لگے گا۔ برسوں کے پاپ ہیں۔ ایک دن میں تو حل نہیں ہو سکتے۔ جب تک میں کیا کروں۔؟"

وہ سوچ سوچ کر بولی۔ "تم سیدھے یہاں سے دائیں فٹ پاتھ پر چلے جاؤ۔ تیس میل چھوڑ کر چوتھے کراسنگ پر بائیں کو گھوم جاؤ اور پہلی کوٹ لین کی سیر کر آؤ۔"

"پہلی کوٹ لین کیا ہے؟" میں نے اُس سے پوچھا۔ "نام تو دلچسپ معلوم ہوتا ہے"

"خود بھی دلچسپ ہے۔ اگر دلچسپ نہ لگے تو سیدھے یہیں اسی لانڈریٹ میں واپس چلے آؤ۔ ورنہ اگلے چوراہے پر گھومو، نہیں تو شام کو ڈنر پر۔"

"ورنہ کل صبح کا ناشتہ تمہارے گھر پر کروں گا۔" میں نے اُس سے کہا۔

"حبیبہ ہے جب تک تمہارے کپڑے سوکھ جائیں گے۔ لندن میں سورج تو نکلتا نہیں۔ کپڑے بھی مشین سے نکالنے پڑتے ہیں۔" حبیبہ بولی اور میں اُسے بائی بائی کہہ کر پہلی کوٹ لین کی طرف روانہ ہو گیا۔

چپٹی کوٹ لین لندن میں ایشیائی مرد کا واحد بازار ہے۔ اور اسے "چپٹی کوٹ لین" کا طعنہ یہ نام غالباً اس لئے دیا گیا ہے کہ یہاں خریدو فروخت کیلئے عورتیں بہت کم آتی ہیں۔ زیادہ تر انگریز عورتیں ہوتی ہیں۔ مگر غریب طبقہ کی۔ کچھ ہندو، پاکستانی اور بنگلہ دیشی عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ کوئی سودا میں ہیں۔ کبھی اپنے ملک کی طرح، تھوں میں کپڑا لے لے اور انگریزی سردی سے بچنے کیلئے ڈھیلا کوٹ پہنے بھاؤ تاؤ میں مصروف نظر آتی ہیں۔ چپٹی کوٹ لین کی قیمتیں بھی ایشیائی ہیں۔ ان قیمتوں میں لچک ہوتی ہے۔ بھاؤ تاؤ ہو سکتا ہے مناسب حدود میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کے مزاج اور مزاج پر کھا جا سکتا ہے شکست بھی کھائی جا سکتی ہے۔ جیت بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ مشرق میں خریداری ایک آرٹ ہے۔ مغرب میں وہ ایک ضرورت و جلد سے جلد پورا کرنے کا نام ہے۔ اسی لئے لندن ایسے صنعتی شہر میں مجھے چپٹی کوٹ لین کو دیکھ کر اچھا لگتا ہے۔

چپٹی کوٹ لین "ایل" (L) کی شکل کا ایک بازار ہے۔ داخل ہوتے ہی دونوں طرف ورائٹی اسٹور کی قسم کی دکانیں نظر آتی ہیں۔ بیچ میں ایک دستی چوک ہے۔ چوک سے دائیں طرف وہ بازار اپنے لکڑی کے سٹال، پھلوں کی ٹوکریوں سے سجا ہوا ہے۔ لوگوں سے خوب بھرا ہوا ہے۔ سڑک پر کیچڑ ہے۔ فضا میں وہی بدبو ہیں اور خوشبوؤں کی ملی جلی کیفیت ہے جو ایشیائی بازاروں میں پائی جاتی ہے۔ یہاں شور بہت کم ہے۔ خریداری چپکے سروں میں ہوتی ہے۔ "continent" کی عورت تو ذرا مشکل سے ہی کسی ایک سودے کو طے کرنے پر اصرار کرتی ہے اور تکلف کرتے ہی پاکستانی عورت کی طرح زبان چلانے لگتی ہے۔ مگر یہ وصف میں نے مغربی عورت میں کم پایا ہے۔

میں ٹہلتا ٹہلتا آگے بڑھتا گیا۔ "ہری بریڈ فورڈ کلیئرنس سیل" کے سامنے بڑی بھیڑ تھی The Bread ford clearance sale کے سامنے بڑی بھیڑ تھی۔ یہاں بچوں کے ریڈی میڈ کپڑے سستے داموں فراک ملتے ہیں۔ پاکستانی اور ہندوستانی دکانوں سے آتا ہے۔ انگلستان سے بہت سستا ہوتا ہے۔ درزی بھی ہندو، پاکستانی ہوتے ہیں۔ وہ بھی انگریز درزیوں سے بہت سستے ہوتے ہیں۔ اس لئے "ہری بریڈ فورڈ کلیئرنس سیل"

سال بھر کلیرنس سیل کرتا رہتا ہے۔ اور کوئی انگریزی دوکان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ "ماسٹر غفورا ٹیلر ماسٹر" جو اس دوکان کا مالک ہے اُس نے مجھے بتایا۔

غفورا کوئی ساٹھ برس کا ہوگا۔ رنگ سانولا۔ آنکھوں میں کاجل، ترشی ہوئی مونچھیں سفید بالوں میں مہندی کا خضاب، آواز ایسی کرارا تھی معلوم ہوتا تھا۔ ابھی جامع مسجد کی سیڑھیوں سے کباب بیچتا بیچتا اُٹھ آیا ہے۔

"سرکی والان کے ہیں ہم۔" بڈھا بڑے ٹھسّے سے بولا۔ دونوں چھوٹے بھائیوں کو بھی یہاں بُلایا ہے۔ فیضو اور نواب دونوں سلائی کرتے ہیں۔ دو پاکستانی درزی بھی کام کرتے ہیں۔ معراج اور گاما۔ دونوں بھائی گیٹ کے ہیں۔ کیا خطرناک سلائی کرتے ہیں۔ اب دو سکھ درزی بھی بڑھا دئے ہیں دوکان پر"

"تخصیص کیوں؟"

"اچھی سبھی کو مال بیچنا پڑتا ہے۔ طرح طرح کے لوگ آتے ہیں۔ اس لئے دوکان پر دو سیلز مین بھی رکھ دئے ہیں۔ لونڈے ہیں۔ مگر اچھا کام کرتے ہیں۔"

"کب سے یہاں ہو؟"

"تیس سال سے۔"

"انگریزی کتنی سیکھی؟"

"یس (Yes)، نو (No)، تھینک یو (Thank You)، کم (Come)، گو (Go)" بڈھا اپنی انگلیوں پر گنتا ہوا بولا۔ "بس یہ پانچ لفظ آتے ہیں۔

یس۔ نو۔ تھینک یو۔ کم۔ گو۔"

"بہت کم گو ہیں آپ!" میں نے مسکرا کر کہا۔

بڈھے نے زور کا قہقہہ لگایا۔ "اپنی زبان کے اس مزے کو تو ترس گئے یہاں ہندی اور ملتوں چاہنے والوں نہیں نے انگریزی زبان میں۔ بڑی ہی بدقیلی زبان ہے صاحب! کسی انگریز سے سننے معلوم ہوتا ہے منہ میں برف کی ڈلی رکھ کر بات کر رہا ہے۔"

"مزے میں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔"

"یہاں آکر کتنی شادیاں کیں؟"

"تین!"

"ہندوستانی کہ پاکستانی؟"

"سب انگریز ہیں صاحب!" بڈھا اپنی ترشی ہوئی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "الحمد للہ!"

"تینوں تمہارے ساتھ رہتی ہیں؟"

"ہاں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "یہاں تو اس ملک میں ایک سے زیادہ شادی ایک وقت میں ناممکن اور غیر قانونی ہے۔"

"تینوں کو مسلمان کیا ہے صاحب!" بڈھا میری حیرت کو دیکھ کر بڑی مسرت سے بولا۔ "تینوں ساتھ رہتی ہیں۔ وہ سامنے والے مکان میں۔ وہ جو آئس کریم بیچنے والے۔ بنے کی دوکان کے اوپر ہے۔ وہ مکان میرا ہے۔ میں نے خود خریدا ہے۔ ان تینوں کو وہاں رکھتا ہوں۔"

"تینوں اکٹھی رہتی ہیں۔" میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ "اور تم سے کچھ باز پرس نہیں کرتیں؟"

"ابی ذرا چیں چپڑ کریں تو سالیوں کی کھال اُدھیڑ کے رکھ دوں۔" بڈھا ہوا میں ایک خیالی ہنٹر گھماتا ہوا بولا۔

کچھ قدم آگے چل کر میں ایک انگریزی دوکان پر رک گیا۔ جو بھنے ہوئے چسٹ نٹ Chest nut بیچتا تھا۔ گرم گرم اور مزے دار چھلکے توڑ کر کھا رہے۔ اپنے وطن کے سنگھاڑے یاد آگئے۔ اور چنا جور گرم بیچنے والے فرق صرف اتنا ہے کہ چنا جور گرم بیچنے والا بڑی رنگین آوازیں لگاتے ہیں اور یہ حضرت نہایت خاموشی سے چسٹ نٹ بھون کر بیچتے جاتے تھے۔ کچھ اداس بھی معلوم ہوتے تھے۔ بیوی کا بازو پر ایک کالی

پٹی لگا رکھی تھی۔ اور گود میں ایک پیاری سی بچی کو اُٹھا رکھا تھا۔ جو مشکل سے تین سال کی ہو گی۔ نیلی آنکھوں اور گلابی رخساروں والی۔ یہ بچی بہت ہی پیاری معلوم ہوتی تھی۔ میں نے جب اس بچی سے مانوس ہونے کی کوشش کی تو انگریز نکلی۔ معلوم ہوا اسکا نام کانرائے (Conroy) ہے۔ وہ انگریز نہیں۔ آئرش ہے۔ سات دن ہوئے اس بچی کی ماں چل بسی۔ اب اس بچی کے باپ ہی کو اسے دیکھنا پڑتا ہے اور دوکان بھی چلانی پڑتی ہے۔ اور وہ اتنا امیر نہیں ہے کہ کوئی نرس رکھ سکے۔ بڑی مصیبت ہے۔!

چسٹ نٹ خریدنے والے دو اور گاہک آگئے تھے۔ میں نے بچی کو گود میں لے لیا۔ ادھیڑ عمر کا کانرائے چسٹ نٹ بھوننے لگا۔ جب گاہک چلے گئے تو اور بھی مجھ سے گھل گیا۔

"اس بچی کا نام کیا ہے۔"

"ڈولی!"

"بالکل پھولوں کی ڈلی معلوم ہوتی ہے۔"

جب میں نے ترجمہ کر کے بتایا تو وہ میری تعریف سے بہت خوش ہوا۔ بولا۔

"ہمارے آئرلینڈ میں لڑکیاں بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔"

میں بھی چپ رہا۔ وہ بھی چپ رہا۔ پھر بڑی اُداسی سے بولا۔ "مگر بڑی ہو کر سب امریکہ چلی جاتی ہیں۔"

پھر ذرا سے وقفہ کے بعد اپنی لڑکی کو وہ عجیب سی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "جانے یہ بڑی ہو کر کہاں جائے گی؟ جب تک "مولی" زندہ رہی (Molly) مجھے اس کی طرف سے کوئی فکر نہ تھی۔ مولی بڑی بہادر لڑکی تھی۔ ہم دونوں مل کر جی لیتے تھے۔ اب میں اکیلا رہ گیا ہوں ..... بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے۔"

مجھے ایسا لگا جیسے میں اپنے گاؤں کی چوپال پر بیٹھا ہوں۔ نیلی آنکھوں کے اندر وہی میٹھی نگاہیں ہیں۔ گوری چمڑی کے اندر وہی کالی مصیبتیں ہیں۔ بھنے ہوئے چسٹ نٹ کی

جگہ باجرے کے بھنے ہوئے دانے ہیں۔ ڈالی کا کیا ہوگا؟۔۔۔ چمیلی کا کیا ہوگا۔۔۔ یونہی چہچہاتی رہے گی، اسی طرح زندگی گذرتی رہے گی۔'

چناچور گرم ۔۔۔

عرصہ گذرا میرے بچپن کا ایک دوست تھا، خوش حال سنگھ۔!

پہلی سے پانچویں جماعت تک ہم اکٹھے پڑھے۔ پھر میں گاؤں سے شہر چلا آیا اور وہ وہیں گاؤں میں رہ گیا۔ کیوں کہ اس کے ماں باپ غریب کسان تھے اور اپنے بچے کو مزید تعلیم نہ دلوا سکتے تھے۔ خوشحال سنگھ بہت ذہین تھا۔ مگر تعلیم پڑھنے میں اس کا جی نہ لگتا تھا۔ اور کھیتی باڑی میں بھی نہیں لگتا تھا۔ بس اسے ہر وقت کھیل کی دھن سوار رہتی تھی اور موقع بے موقع اسے ہنسنے کی عادت تھی۔ اس کے چوڑے چکلے چہرے پر اس کی ناک بہت بڑی تھی اور ناک سے زیادہ اس کے نتھنے بڑے تھے۔ یہ نتھنے بڑے ہونے کے علاوہ بے حد پتلے تھے۔ اس قدر پتلے اور بڑے کہ جب وہ زور سے سانس اندر کھینچتا تو یہ نتھنے زور زور سے پھڑپھڑانے لگتے تھے اور کافی توجہ اور مشق کے بعد وہ ان نتھنوں سے ایک خاص عجیب حرص کی آواز نکالتا تھا۔ اس کا قاعدہ یہ تھا کہ پہلے وہ زور سے ہنستا تھا اور پھر اک دم اپنی ہنسی روک کر ناک سے سانس اندر کو کھینچتا اور پھڑپھڑاتے ہوئے نتھنوں سے ایسی آواز نکالتا۔ یہ وہ منہ سے ہنسنے کے بجائے ناک سے ہنس رہا ہو۔ اسے ان نتھنوں پر ایسی قدرت حاصل تھی کہ اس کے چہرہ کا عجیب فن کاری میں بدل گیا تھا۔ اور ہم نے اس کی ناک کے قہقہے کو سننے کے لئے بیتاب رہتے اور اپنی ناک سے ایسی ہی آواز نکالنے کی کوشش کرتے۔ مگر انتہائی کاوش کے بعد بھی طوبت کے سوا وہاں سے کچھ نہ نکلتا۔ اس بات کو شاید پینتیس چھتیس برس ہو گئے ہوں گے۔ گاؤں سے آنے کے بعد میری ملاقات خوش حال سنگھ سے کبھی نہیں ہوئی۔ اس وقت چلتے چلاتے میری نگاہ "پنجاب ٹی ہاؤس" کے بورڈ پر پڑ گئی تو چائے پینے کے ارادے سے میں ٹی ہاؤس میں داخل ہو گیا۔ اور داخل ہوتے ہی میں نے ایک زوردار قہقہہ سنا۔ یہ ایک کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا ادھیڑ عمر کا، بھاری جثے کا پونے چکلے چہرے والا ایک سکھ تھا۔ اور کسی پنجابی سے

باتیں کر رہا تھا۔ قہقہہ لگا کر اس آدمی نے جب ایک دم اپنا سانس روکا تو اس کے پھڑپھڑاتے ہوئے نتھنوں سے ایک ایسی آواز نکلی جس نے مجھے ایک لمحہ میں آج سے پینتیس برس پہلے اپنے گاؤں میں پہنچا دیا۔ میں نے تیزی سے قدم بڑھایا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر کاؤنٹر کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے چلا کر کہا۔

"خوشحال سنگھ!"

کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا آدمی چند لمحے تو مجھے گھورتا رہا۔ پھر ایک دم چوڑی چکلی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ اس نے میرا نام لے کر مجھے ایک موٹی سی گالی دی اور دوسرے لمحہ میں کاؤنٹر کو پھلانگ کر اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر مجھے دبوچ لیا۔ اور ہم دونوں بغلگیر ہوتے ہوئے ایک دوسرے کو کھینچتے ہوئے ایک ٹیبل پر جا گرے۔ جہاں ایک انگریز جوڑا بیٹھا تھا۔ وہ بے چارے جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میز کی پیالیاں نوٹ گئیں۔ پلیٹ، کانٹا، نیپکن ٹاپ بھی نوٹ گیا۔ اب ہم دونوں میز کے اندر تھے۔ ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے اور ایک دوسرے کو چوم رہے تھے۔

پہلے چند سیکنڈ تو لوگ ہماری لڑائی دیکھ کر ہراساں تھے، کچھ لوگ تو پولیس کو بھی بلانے کی فکر میں تھے۔ مگر جب ہم نے ایک دوسرے کا منہ چومنا شروع کیا تو لوگ ہنسنے لگے اور انگریز جوڑے نے بھی میز کے اندر سے نکلنے میں ہماری مدد کی۔ اور ہم دونوں نے بھی ان سے معذرت چاہی۔ انہیں خوشحال سنگھ نے جلدی سے پنجابی اور انگریزی کا ملغوبہ استعمال کرتے ہوئے بتایا۔

"میتوں میرا یار ملیا۔ آفٹر تھرٹی فائیو ائرس After Thirty Five Years می ایکس کیوز یو میم صاحب انگریز صاحب Me excuse you, Mem Sahib! میں نے خوشحال سنگھ سے پوچھا۔ "اب یہ میز جو ٹوٹ گئی ہے اس کے پیسے کون دے گا؟"

"باہر چل بتاتا ہوں۔" خوشحال سنگھ مجھے کندھے سے تھپیٹ کر باہر لے آیا اور

"پنجاب ٹی ہاؤس" کے بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"اس کو پڑھ۔"

پھر خود ہی پڑھنے لگا۔ "دی پنجاب ٹی ہاؤس، پروپرائٹر۔ خوشحال سنگھ بکاں والا۔ چیف خاندان۔ ڈسٹرکٹ فیروزپور، صوبہ پنجاب۔۔۔" پھر میری طرف دیکھ کر اس نے زور کا قہقہہ لگایا، پہلے منہ سے، پھر ناک سے، پھر میرے کندھے سے منہ ملتے ہوئے بولا۔ "یہ ٹی ہاؤس میرا ہے۔ اور پیٹی کوٹ لین میں چھ سات بھی ہیں اور ایک مکان بھی خریدا ہے میں نے پیٹی کوٹ لین میں۔ چل گھر پہلے بھابھی سے مل۔"

حیل حجت کا موقع نہ تھا۔ میں سیدھا اس کے گھر چلا گیا۔ سلیٹی رنگ کا تین منزلہ مکان تھا۔ نیچے کی منزل میں اس کی کپڑوں کی دوکان تھی۔ دوسری منزل اس نے کرایہ پر اٹھا رکھی تھی اور تیسری منزل میں وہ خود رہتا تھا۔

"او آرتھر دی مدرلے۔ او آرتھر دی مدر لے۔ باہر نکل۔ دیکھ کون آیا ہے۔"

خوشحال سنگھ کا شور سن کر آرتھر دی مدر لے باہر نکل آئی۔ بڑی جنس فلیو انٹرپرائز عورت تھی۔ شلوار قمیض پہنے ہوئے۔ اپنی عمر پر ایک بچہ اٹھائے ہوئے تھی۔ بالکل اپنے گاؤں چیف خاندان کی عورتوں کی طرح۔ آتے ہی اس نے مجھ سے پنجابی میں کہا۔

"جی آیاں نوں۔!" اور میرا جی خوش ہو گیا۔

"یہ آرتھر کون ہے؟" میں نے خوش حال سنگھ سے پوچھا۔

"میرا بڑا لڑکا ہے۔" خوش حال سنگھ بولا۔ اور پھر آواز دے کر چلانے لگا۔

"او آرتھر!۔ او آرتھر!۔ او آرتھر دے بچے۔۔۔!"

باپ کا شور سن کر آرتھر بھی ایک کمرے سے باہر نکل آیا۔ آرتھر اونچا، لمبا اٹھارہ برس کا لڑکا تھا۔ رنگ گورا۔ آنکھیں نیلی، بال سنہرے۔ سنجیدہ اور خوبصورت۔ انٹرپرائز اور سکھ کا حسین امتزاج۔

"یہ ہے میرا بیٹا آرتھر سنگھ" خوش حال سنگھ بڑے فخر سے بولا۔

"آرتھر سنگھ کیا نام ہوا؟" میں نے خوشحال سنگھ سے پوچھا۔

"اگر باپ کا نام خوشحال سنگھ ہو سکتا ہے تو بیٹے کا نام آرتھر سنگھ کیوں نہیں ہو سکتا؟" خوشحال سنگھ نے مجھے سمجھایا۔ "اور پھر ہمارے ہاں اگر جرنیل سنگھ اور کرنیل سنگھ ہو سکتے ہیں تو آرتھر سنگھ کیوں نہیں ہو سکتے؟"

خوشحال سنگھ نے مجھے لاجواب کر دیا۔

خوشحال سنگھ اپنی مسکراتی ہوئی بیوی کی طرف دیکھ کے بولا۔۔۔ "میں نے آرتھر کی مدر نوں امرت چکھا دتا ہے۔ اب یہ سسٹھنی ہے سسٹھنی بڑی مدھر کڑھی بناتی ہے اور سرسوں کا ساگ!"

"سرسوں کا ساگ بھی!" میں نے حیرت سے پوچھا "لندن میں؟"

"ہاں۔" خوشحال سنگھ میرے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولا۔ "ہوائی جہاز سے منگاتا ہوں۔ سنڈے کے سنڈے۔ آج کھلاؤں گے اپنے یاروں"

پھر خوشحال سنگھ نے آرتھر کی مدر کو کچن کے کھانے کے لئے چند ضروری ہدایات دیں اور جب وہ چلی گئی اور آرتھر بھی اپنے کمرے میں چلا گیا تو خوشحال سنگھ نے ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

کیا کرتے ہو؟"

"کتابیں لکھتا ہوں۔"

"اوے۔۔۔" خوشحال سنگھ نے مجھے بڑی موٹی سی گالی دے کر کہا۔ "تو ایسے کا ایسا نکما ہی رہا۔ اُدھر گاؤں میں بھی تو ایسا ہی احمق تھا۔ یاد ہے جب ہم ندی کے کنارے مچھلیاں پکڑتے تھے تو تو آسمان پر اڑتے ہوئے بادل گنا کرتا تھا۔"

خوشحال سنگھ نے میری حماقت پر بڑی افسردگی سے سر ہلایا اور پھر پوچھا۔

"کوئی گھر بنایا؟"

"نہیں۔"

"بینک میں کتنا جوڑا؟"

"ساڑھے سینتالیس روپے!"

"اوئے کملا۔ تو بالکل نالائق نکلا، چچ چچ۔" خوشحال سنگھ مجھ میری طرف رحم کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر چند لمحوں کی سکوت کے بعد اُس کے چہرہ کا فیوز ایک دم جل گیا۔ ایک چٹکلی مسکراہٹ اس کے سارے چہرہ پر پھیل گی۔ اور اس نے بڑی محبت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تو نے اچھا کیا جو لندن چلا آیا۔ میں تجھے کوا دھر چینی لوٹ لین میں کباب کی ایک دوکان کھول دیتا ہوں۔"

"کباب کی؟"

"ہاں۔ کتاب چھوڑ کباب بچ۔ بڑا مندہ ہے۔ ادھر ایسے لندن میں ڈیڑھ لاکھ سے زاید پاکستانی ہوں گے۔ اور ستر اسی ہزار شرابی ایک لاکھ ہندوستانی ہوں گے۔ دھر کباب کی دوکان خوب چلے گی۔ دوکان میں مال میں وہاں کا بناؤں گا میں دوکان پر بیٹھ کر گلہ گلہ۔"

میں چپ رہا۔

"بول۔!" اس نے مجھ سے پوچھا۔ "کتاب کہ کباب؟"

"کتاب!" میں نے کہا۔

خوشحال سنگھ نے مجھے زور کا ایک دھکا دیا۔ میں صوفہ پر سے اچھلتے بچا۔ "تیری کھوپڑی ہمیشہ سے اُلٹی تھی۔ وہ اپنے سکول کا مولوی ٹھیک کہتا تھا۔ یہ لڑکا نالائق نکلے گا..."

خوشحال سنگھ نے ناامیدی میں سر ہلا دیا۔

کھانے کے بعد خوشحال سنگھ مجھے چینی لوٹ لین کی سیر کرانے کے لئے میرے ساتھ ہو لیا۔ وہ ایک شاہانہ وقار کے ساتھ چلتا ہوا اپنے جاننے والوں کو مجھے دکھا رہا تھا۔

چلتے چلتے چینی لوٹ لین کے تقریباً آخر میں میرے قدم ایک جگہ رک گئے۔ یہاں بہت بھیڑ تھی۔ ایک ادھیڑ عمر کے انگریز کے گرد بہت سے لوگ جمع تھے۔

"چلو چلو۔ یہاں مت رُکو۔" خوشحال سنگھ نے مجھ سے آہستہ سے کہا۔

"کیوں؟" میں نے اندھے بھنگ کر کہا۔ "دیکھنے دو، یہ کیا تماشہ ہے کون ہے یہ؟" "یہ الفونسو ہے انگریز مجمع باز!"

میں نے آج تک کوئی انگریز مجمع باز نہیں دیکھا تھا اس لئے اُسے قریب سے دیکھنے کیلئے آگے بڑھ گیا۔

اس شدید سردی کے عالم میں بھی اس ادھیڑ عمر کے انگریز نے لانگ کوٹ تو کیا، وئی وٹ یا جرسی تک نہیں پہن رکھی تھی۔ ایک ڈھیلی ڈھالی چارلی چپلن نما پتلون تھی جو تقریر کرتے وقت بار بار نیچے سرک جاتی تھی اور وہ اُسے جھٹکے دے کر اونچا کر لیتا تھا اور مجمع بازوں کی پیٹی اور بلغمی آواز میں برابر بولے جا رہا تھا۔ وہ کھانسی کی کوئی دوا بیچ رہا تھا۔

اس نے کاغذ کی پڑیا پر پوٹاشیم پرمیگنیٹ رکھی اور پھر اُسے ایک تیزابی سلائی دکھاتے ہوئے بولا۔

"See What Happens"

تیزابی سلائی دکھاتے ہی پوٹاشیم پرمیگنیٹ بھک سے اُڑ گیا۔

انگریز مجمع باز بولا "دیکھا جس طرح ایک تیزابی سلائی دکھاتے ہی یہ پاؤڈر جل گیا، اسی طرح میری محبوب دوا کھانسی کی دوا چٹکی میں کھانسی کو پھیپھڑوں کے اندر جلا دیتی ہے" پھر اس نے کھانسی کی دوا کی پڑیوں کا بنڈل اُٹھایا۔ اور وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر خوشحال سنگھ پر پڑ گئی۔

نظر پڑتے ہی انگریز کا چہرہ سُرخ سے سُرخ تر ہوتا گیا۔ اس کی اودی ناک گہرے جامنی رنگ کی ہو گئی۔ اس کی تقریر کا رُخ ایک دم بدل گیا۔ اب وہ کھانسی کی دوا کا ذکر چھوڑ کر لندن میں رہنے والے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں پر بولنے لگا۔ اس کا لہجہ شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ خالص لندنی لہجہ میں بڑی زوردار انگریزی میں کالے آدمیوں کو گالی سنا رہا تھا۔

مجمع میں کئی انگریز لڑکے برہم ہونے لگے اور غصہ سے میری طرف اور خوشحال سنگھ کی طرف دیکھنے لگے۔ چند ہندوستانی مجمع سے دور سرک گئے۔ مگر خوشحال سنگھ اپنی جگہ کھڑا مسکراتا رہا۔ اُس نے خاموشی سے اپنے ایک گرگے کو اشارہ کیا۔ وہ آدمی وہاں سے چلا گیا۔

چند منٹ کے بھاشن کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے انگریزوں کا پورا مجمع مشتعل ہونے کو ہے۔ مگر اسی وقت ایک بابی (لندن پولیس کا ایک فرد) آگیا۔ اور وہ رالفو یعنی رالف کو پکڑ کر پبلی کوٹ لین کے باہر لے گیا۔

مجمع منتشر ہونے لگا۔

خوشحال سنگھ نے مسکرا کر کہا بڑی دلجمعی سے۔ "بے چارے رالفو نے پھر زیادہ پی لی ہے۔ زیادہ پی کر وہ ہم لوگوں کو گالیاں سنانے لگتا ہے۔"

"کیوں؟"

"بے چارے کا دھندا آج کل ٹھیک نہیں چلتا ہے۔" خوشحال سنگھ بولا۔

"ہمارے ہندوستانی مجمع بازوں کے سامنے اُس کی ایک نہیں چلتی۔"

"کیا وہ بابی اُسے گرفتار کر کے لے گیا ہے؟"

"نہیں۔ اِدھر رفنی رسٹیورنٹ میں اُس کو ٹھنڈا کرے گا۔ لندن کے سنتری بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔ شاید اُس کو ایک آدھ پیگ پلائے گا۔ پھر اُس سے گھر بھجوا دے گا۔ اسی لئے میں تم سے کہتا تھا۔ یہاں مت رُکو۔ مجھے دیکھ کر اس کو بہت کُرسٹ آتا ہے۔"

"بے چارہ رالفو۔ چلو آگے چلو!"

چلتے چلتے میرے ذہن میں رالف کا اداس اور غمزدہ چہرہ گھومنے لگا۔ اور اُس کی بھاری آواز کی گونج سنائی دی۔

رالف نے اپنے لئے غلط پیشہ چنا۔!" میں نے خوشحال سنگھ سے کہا۔ "وہ اگر پارلیمنٹ کا ممبر ہوتا تو زیادہ کامیاب رہتا۔

آج کل جتنے مجمع باز تھے سب پارلیمنٹ کے ممبر بنے ہیں۔

لندن کی پانچویں شام

خوبصورت عورت کا بڑھاپا کچھ ہوئے آتش فشاں پہاڑ کی طرح ہوتا ہے۔ اب اوپر برس چکا۔ آب و آتش کا طوفان گزر چکا۔ اب کریٹر کی تہہ میں کچھ گرم راکھ باقی ہے۔ جس میں کبھی کبھی چند شرارے چمکتے ہیں۔ رنی میں میں نے حبیبہ کی نوجوانی کا سراپا دیکھا تھا۔ اور اب لندن میں اُس کا بڑھاپا دیکھ رہا ہوں۔ بیچ میں تیس سال تھے۔

"رنی کی وہ شام مجھے اکثر یاد آتی ہے" میں نے حبیبہ سے کہا۔ "جب میں نے تمہیں پہلی اور آخری بار انصاری کے گھر دیکھا تھا۔ تم نے جوتے اُتار دیئے تھے اور غالیچے پر مٹک مٹک کر ٹہل رہی تھیں، یا ٹہل ٹہل کر مٹک رہی تھیں۔"

"اب کچھ بھی کہو۔" حبیبہ ایک اُداس تبسم سے بولی۔

"مجھے اجازت دو کہ میں تمہارا سراپا بیان کر سکوں۔ ذہنی سراپا۔ کیوں کہ خوبصورت عورت محض جسم ہی تو نہیں ہوتی، وہ ایک تاثر ہوتی ہے۔ بار بار مجھے تمہارے جسم کا رنگ یاد آتا ہے۔ تمہارے آنکھ انگ سے نوریوں چمک رہا تھا، جیسے پانی کی صراحی سے سراب کی رنگت چھلکتی ہے۔ وہ نور کس چیز کا تھا؟"

"اس سمجھ کا کہ میں بہت خوبصورت ہوں۔" حبیبہ ہنس کر بولی۔

"تمہاری یہ کشش ہنسی اب تک باقی ہے۔ جانے کس طرح تم نے اسے محفوظ رکھا ہے۔ میرے لئے یہ ایک معمہ ہے۔ بہر حال تمہاری یہ ہنسی آج بھی انگلینڈ کے اس موسم میں اٹلی کے آسمان کی یاد دلاتی ہے۔"

"شکریہ!" حبیبہ میرا ہاتھ ذرا سا دبا کر بولی۔ "اس عمر کو پہنچ کر ہر خوبصورت عورت ایک بھکارن بن جاتی ہے۔ تعریف کے ایک ٹکڑے کے لئے ترستی ہے۔"

"مجھے یاد کر لیتے، وہ دن!" میں نے کہا۔ "فالسئی خمار سے طلائی جام میں جھم جھماتا ہوا۔ ریشمی جالی کے دھوئیں میں آگ کی طرح سلگتا ہوا۔ بے پہن بانہوں میں تھرکتا ہوا۔ مضمحل زمرد اور پھٹ پڑنے کے لئے تیار۔ تمہارا حسن بڑا خطرناک تھا۔ آج میں یہ کہتا ہوں تو لگتا ہے کہ کسی آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑا ہوں۔ مگر جسم سے زیادہ تمہاری باتیں یاد ہیں۔ حسین عورت کی حماقت کی باتیں بھی کرنے لگے تو قیامت ہو جاتی ہے۔"

"مزے کی بات یہ ہے کہ تم مجھے بالکل یاد نہیں ہو۔" حبیبہ بولی۔

"اس وقت میں یاد رکھنے کے لائق نہ تھا۔" میں نے بتایا۔ "عورت کی نوجوانی مرد کی نوجوانی سے مختلف ہوتی ہے۔ عورت کی نوجوانی مکمل ہوتی ہے۔ مرد کی ادھوری اور کچی۔ اس پر آگہی کا عالم دیر میں آتا ہے۔"

حبیبہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر مسکرائی۔ پھر ذرا سے بے بارہ ہنس پڑی۔ جیسے صاف شفاف اور چمکتے پانی کا فوارہ فضا میں بلند ہو گیا ہو۔ یہ یا ہے وہ ایسے چپ ہو گئی جیسے کسی نے فوارے پر پانی رکھا دیا ہو۔ میں نے دیکھا کہ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ یاد کر رہی تھی۔

"میرا نام میرے لئے ہمیشہ ایک پہیلی رہا ہے۔ وہ ہنس کر بولی۔

"اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مجھے کبھی پیار سے نہیں پکارا گیا۔ یہ بات نہیں تو ہوا ہی نہیں کوئی مرد کسی عورت کی خوبصورتی سے اتنا یا نہیں ہوتا جتنا وہ ہوتی ہے۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ تم لکھتے ہو۔ خوبصورتی ایک تاثر بھی ہوتا ہے۔

تم ایسا کیوں کہتے ہو کہ ایسا ہے اندر خوبصورتی نہیں ہے تو تم کہتے ہو کہ خوبصورتی محض ایک تاثر بھی ہوتا ہے۔ ایسی خوبصورتی کو ہاتھ لگانے سے بھی خوبصورتی نہیں

ہو جاتی ہے؟ میں پوچھتی ہوں گلاب کے پھول کا مالک آج تک کون ہوا ہے؟"

میں یہ نہیں کہتی کہ شادی بری ہے۔ مگر یہ حس طبیعت بری ہے اور پھر مردوں کا یہ دوغلا پن۔ شادی سے پہلے میری جان، میری ڈارلنگ کہتے ہوئے منہ سوکھتا ہے۔ ہاتھ جوڑتے ہیں۔ ایک نگاہ کے لئے ترستے ہیں۔ گڑگڑاتے ہیں۔ پاؤں پڑتے ہیں۔ پھر شادی کرتے ہی گھر کے آنگن میں لے جا کر کھونٹ پر باندھ دیتے ہیں۔ ایک گائے یا بھینس کیطرح جس کا دودھ دوہا جائے گا اور جس سے بچھڑا پیدا کیا جائے گا۔"

حبیبہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھیں ڈھواں ڈھواں ہو گئیں۔

حبیبہ کی تلخی اس کی زندگی سے متعلق تھی۔ حبیبہ کا پہلا شوہر ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ اس نے حبیبہ کو حوالات میں رکھنا چاہا۔ حبیبہ اس کی خوبصورتی اور وجاہت پر بچھ گئی تھی۔ مگر یہ وجاہت محض اوپری تھی۔ اس کا پہلا شوہر ایک بیل کی طرح مضبوط تھا اور ایک سانڈ کی طرح مغبوط۔ اس کے اندر وہ نزاکتی احساس نہ تھی جس کے بغیر حبیبہ زندہ نہ رہ سکتی تھی۔ لہذا وہ اپنے پہلے شوہر سے رسیاں تڑوا کے بھاگی۔

دوسری بار اس نے ایک آئی سی ایس سے شادی کی۔ شادی سے پہلے کورٹ شپ رہا۔ اس زمانے میں مرد ایک دوسرا ہی آدمی ہوتا ہے۔ انصاری کو معلوم ہو چکا تھا کہ حبیبہ حسین ہونے کے علاوہ ذہین بھی ہے۔ خوش ذوق اور حساس بھی ہے۔ لہذا اس نے اپنی کورٹ شپ شیلی سے شروع کی۔ بیچ میں غالب آئے، براؤننگ آئے۔ ٹیس کی مصوری آئی، جدید شاعری آئی۔ چلے شادی ہو گئی۔ حبیبہ بہت خوش تھی۔ ڈھنگ کا ایک شوہر تو ملا۔

مگر انصاری کو شادی کرنے کے بعد پھر آئی سی ایس بن گیا۔ حبیبہ سے ایسا سلوک کرنے لگا جیسے وہ اس کی بیوی نہیں اس کی انڈر سیکریٹری ہو۔ اس کی باتوں کی حلاوت ہی ہوتی رہی۔ ایسا لگتا جیسے وہ اپنی بیوی سے بات نہ کر رہا ہو، کسی فائل پر دستخط کر رہا ہو۔ حبیبہ کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اس نے انصاری سے بھی طلاق لے لی۔ اس اثناء میں اس کا سابق پہلا شوہر سپرنٹنڈنٹ پولیس سے اور دو درجے آئی سی ایس سے ہو گئے۔

مگر حبیبہ اب بھی بڑی خوبصورت تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنے وقت میں شہر بند کی سب سے حسین عورت تھی۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایسا حسن تو آج تک دیکھا ہی نہیں گیا۔ اس لئے حبیبہ کو تیسرا شوہر چننے میں زیادہ وقت پیش نہیں آیا۔ اب کے اس نے ادیب کو شوہر چنا۔ حساس طبیعت، شاعرانہ مزاج، بات بات پر عورتوں کی طرح جھینپ جانے والا۔ حبیبہ کو یہ شوہر شروع شروع میں بہت پسند آیا۔ مگر جلد ہی رنگ اترنے لگا۔ اس خوش ذوقی کی جلد کتنی باریک تھی۔ اس کے اندر کتنی تجارت تھی، شہرت کی کتنی حرص تھی۔ دوسرے ادیبوں کیلئے کتنی جلن تھی۔ ہر وقت پیسے کو گالیاں دینے کے باوجود ہر وقت پیسہ بٹورنے کیلئے کتنی تگ و دو تھی۔ ہر وقت سرمایہ داروں کو گالیاں دینے کے باوجود انہی کی جوتیاں چاٹنے کی کیسی خفیہ خواہش تھی۔ فراخدلی، انسانیت، خدمت اور ایثار کی کا لبادہ اوڑھے ہوئے یہ ادیب اندر سے کتنا تنگ نظر اور خود غرض تھا۔ اس کا اندازہ جب حبیبہ کو ہونے لگا تو اس کی طبیعت بجھتی گئی، بجھتی گئی۔ اور جب ایک دن دھچکے سے اس نے شوہر نے حبیبہ کو مشورہ دیا۔ کہ وہ فلم ایکٹریس بن جائے تو حبیبہ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اگر وہ اس ادیب سے شادی کرنے کی بجائے بازار سے کسی جوہری سے شادی کر لیتی تو وہ اس ہیرے کی پرکھ زیادہ بہتر طریقے سے کرتا۔

حبیبہ اب اس ادیب سے بھی الگ ہو گئی۔ دھیرے دھیرے اب وہ اس نتیجے پر پہنچنے لگی کہ اس نے شادی کرنے ہی غلط کی۔ مگر اس کا حسن ابھی تک شعلہ ساماں اور آتش فشاں تھا۔ اسے دیکھتے ہی ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے انگارے کو چھو لیا ہو۔ مرد اسے گرما اسے ہر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ حبیبہ واقعی اک عشق اور حسن، شاعری اور شادی سے سچی تھی۔ مگر یہ سچی تھے۔ وہ سے پہلے تھے۔ بعد میں باقی عاشقوں سے پرے سے پرے شبد کی ملفیوں کی طرح جھنجھنانے لگتے۔ حبیبہ وہاں سے عشق سے ہوتی آسمان کی بلندیوں تک پہنچی تھی۔ اب وہ ان سے [illegible]

جتنا اس کا انکار پکا ہوتا گیا۔ مردوں کا اصرار بڑھتا گیا۔ یہ تو حبیبہ کی خوبصورتی تھا۔ مگر ان میں دو مرد بے حد قابل توجہ تھے۔ یہ انتہائی [illegible]

حد امیر تھا۔ اس کے سارے بچے بچیاں کے سے تھے۔ اسے دیکھ کر حبیبہ کے دل میں یہ خیال آنے لگا۔ کیوں نہ اب ایک ایسے مرد سے شادی کی جائے جس پر بیوی کے بجائے ماں کا ساحق جتایا جا سکے۔ دوسرا مرد جنگلات کا ٹھیکیدار تھا۔ ان پڑھ اور اپنے ان پڑھ ہونے پر مغرور کیوں کو ان پڑھ ہونے کے باوجود وہ اپنی محنت سے لکھ پتی بن گیا تھا۔ اسے کتابوں سے نفرت تھی۔ فکچر اور شیکسپیر، تھیسز اور فن، مصوری اور شاعری ان سب سے نہ صرف یہ کہ نابلد تھا بلکہ نابلد رہنا چاہتا تھا۔ اس کی صحت بہت عمدہ تھی اور اسے شکار کا بہت شوق تھا۔ اسے دیکھ کر بھی حبیبہ کو خیال آنے لگا کہ اس قدر حساس ذہنی اور تمدنی زندگی بسر کرنے کے بجائے کسی ایسے شوہر کے ساتھ جنگلوں میں زندگی بسر کرنا کس قدر دلچسپ ہوگا۔ کبھی وہ بے وقوف امیر کی طرف جھکتی، کبھی اس کاوں لکڑی کے ٹھیکیدار کی طرف مائل ہوتا نظر آتے۔ کبھی وہ دونوں سے دور رہنا چاہتی اور کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ ان دونوں کو چاہنے کا کوئی سوال نہ پیدا ہوتا تھا۔ صرف یہ سوچ رہی تھی کہ ان دونوں میں سے کس کے ساتھ زندگی گزاری جائے۔

مگر جس بات کا فیصلہ حبیبہ نہ کر سکی اس کا فیصلہ اس کے دونوں عاشقوں نے کر دیا۔ ان دونوں کا قصہ بہت مشہور ہے۔ کس طرح لکھنؤ کے ایک باغ میں ان دونوں عاشقوں نے ڈوئیل لڑا۔ ڈوئیل کی روایت ہمارے ہاں کی روایت نہیں ہے۔ ہر عشق میں یا تو خود زہر کھا لیتے ہیں یا دوسرے کو زہر دے دیتے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں ڈوئیل نہیں ہوتا۔ مگر حبیبہ کے لئے اپنے ہاں کی مقدس روایت بھی توڑ ڈالی۔ اور ان دونوں عاشقوں نے لکھنؤ کے ایک باغ میں پستولیں لے کر ڈوئیل لڑا۔ اور نتیجے میں دونوں ہلاک ہو گئے۔ اخباروں سے پہلے صفحے پر جلی حروف میں اس ڈوئیل کی خبر اور حبیبہ کی تصویر شائع ہوئی اور اس قدر ہنگامہ ہوا کہ سب چوری حبیبہ کو اپنا منہ چھپانے کیلئے ہندوستان میں قیام کرنا پڑا۔ اس کے ماں باپ بہت امیر تھے۔ اس نے لندن میں روپے پیسے کی [illegible] کبھی دقت نہ ہوئی تھی۔ پھر اس نے اپنے بچے لندن بلا لئے اور اس نے تینوں سابق شوہر اپنے بچوں کے لئے معقول وظیفے بھیجتے تھے۔ اس لئے حبیبہ کو کبھی کسی

قسم کی تکلیف نہیں ہوئی...

"بچے کہاں ہیں؟"

"دو تو پاکستان چلے گئے ہیں۔ دو ہندوستان میں ہیں۔ میں یہاں ہوں۔"

اُس کے بدن میں ایک جھرجھری سی آئی۔ اور وہ چپ ہو گئی۔ باہر برف بڑی خاموشی سے گر رہی تھی اور آتشدان میں آگ جل رہی تھی۔ ایک لمبی آہنی سلاخ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اُس کے نبک میں ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا پھنسا کر وہ اُسے آتش دان پر گرم کرتی۔ پھر دوسرا ٹکڑا۔ اس طرح ہم دونوں باری باری آہنی سلاخ سے ٹوسٹ بناتے رہے۔ اور ہمبرگر بنا کر کھاتے رہے۔ ایرانی غالیچہ پر رکھے ہوئے سنہری جام۔ ہم دونوں آمنے سامنے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے اور دیواروں پر حبیبہ کی تصویریں۔ انگلستان کے شاہی خاندان کے ساتھ۔ بڑے بڑے آدمیوں کے ساتھ۔ وہ لوگ اپنے رتبے کے اعتبار سے عظیم تھے یا اپنے فن میں عظیم تھے۔ تو حبیبہ اپنے حُسن میں عظیم تھی۔

"انگریزی قوم کی وضعداری آج بھی باقی ہے۔" حبیبہ میری نگاہ شاہی خاندان کی ایک تصویر پر مرکوز دیکھ کر بولی۔ شاہی خاندان والے خاص خاص موقعوں پر آج بھی حبیبہ کو بلاتے ہیں اور اُس کا شمار لندن کی حسین و جمیل عورتوں میں کرتے ہیں۔

"اس میں کیا شبہ ہے۔" میں نے ذرا غلو سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"میں نے پچپن برس کی ایسی خوبصورت عورت آج تک نہیں دیکھی۔"

"مگر پچپن برس کی۔" حبیبہ نے کسی قدر اُداسی اور تلخی سے کہا۔

میں چپ ہو گیا۔

وہ بولی۔ "میں ایک عرصہ تک اپنی عمر کے خلاف لڑتی رہی۔ شامپو اور ہیئر آئل۔ کریم اور روز، بکل، پاؤڈر، بھاپ اور مالش، وہ سب کچھ جو لڑائی میں جائز ہے۔ میں نے وہ اور میں کیوں نہ کرتی۔ جو حُسن تمہارے پاس ہوتا ہے اُسے سنبھالنے کے لئے بتاتے ہیں۔ میرے پاس تو میرا حُسن تھا۔ تو پھر میں اسے سنبھالنے کی کوشش کیوں نہ کرتی۔ مگر یہ وقت کی چھپی کیسی ظالم ہے۔ بوند بوند کر کے حُسن بہہ جاتا ہے۔ آخر میں

صرف چھلنی کے سوراخ رہ جاتے ہیں۔"

"کیا تمہیں اپنے بچوں سے محبت نہیں ہوئی؟"

"ہوئی۔ بڑے پیارے بچے تھے۔ جب تک میرے پاس رہے اور اب بھی اُن کے خط آتے ہیں۔ مگر اب اس عمر میں تجزیہ کرتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ مجھے اپنے حُسن کے سوائے کسی سے محبت نہیں رہی۔ کسی شوہر سے نہیں۔ کسی دوست سے نہیں، کسی بچے سے نہیں۔ کسی سے بھی اتنی محبت نہیں رہی جتنی مجھے اپنے حُسن سے رہی۔ میں کبھی ماں نہ بن سکی۔ حبیبہ ہی رہی۔"

"شاید یہ اس طرح کی محبت ہے جیسے کسی فن کار کو اپنے فن سے ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مگر فرق ہے۔" حبیبہ بولی "فن کار کا فن اُس کی زندگی کے ساتھ جاتا ہے۔ حُسن راستے ہی میں چھوڑ جاتا ہے۔ یہ اب معلوم ہوا۔"

"اگر حُسن سے تمہاری مُراد جلد کی تازگی ہے۔ اگر حُسن سے تمہاری مُراد صرف آنکھوں کی چمک سے ہے۔ روح کی تازگی سے اور دل کی چمک سے نہیں ہے تو تم سچ کہتی ہو۔ لیکن ایک حُسن اندر کا بھی ہوتا ہے اگر آدمی کوئی مردیا عورت ... وہ حسن اور توازن اپنے اندر حاصل کر لے تو کبھی بڑھاپا نہیں آتا۔ میں نے بالشائے تھیٹر میں پچاس برس سے زیادہ عمر کی بوڑھی اولانوورا کو سولہ برس کی "تیرل" کردار میں تتلی کی طرح ناچتے دیکھا ہے۔ فنی توازن نے وقت اور حُسن دونوں کو منجمد کر دیا تھا۔"

میں اولانوورا نہیں ہوں۔" حبیبہ خفا ہو کر بولی۔ "میں حبیبہ ہوں، میں اس قدر چاہی گئی ہوں کہ میں کبھی اپنے باہری حُسن کو نہیں بھول سکی۔ بھولنے کی کوشش بھی کی تو کسی نے بھلانے نہیں دیا۔"

"حبیبہ!" میں نے اس تلخی کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "جس دن میں نے تمہیں پہلے پہل دیکھا تھا۔ اُس دن تم سے عشق کرنے کا خیال آیا تھا۔ مگر اُس وقت میں بے حد نو عمر تھا۔ اور اب۔!"

"ہاں۔ اور اب؟" اُس نے تیکھی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اب بہت دیر ہو چکی ہے۔" میں نے کہا۔

حبیبہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے اپنا جام اٹھا کر اتنے زور سے "تشدان" میں پھینک دیا کہ میں اُس کے چھناکے سے اُچھل پڑا۔

"کسی انگریز نے آج تک ایسی بیہودگی سے مجھ سے بات نہیں کی۔" وہ غصہ سے بولی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"میں انگریز نہیں ہوں۔" میں نے اس کے دوسرا جام بناتے ہوئے کہا۔

"مگر تم نے انگلستان میں رہ کر کسی انگریز سے شادی کیوں نہیں کی؟"

"کی تھی۔" وہ اپنے آنسو پونچھ کر بولی۔ "وہ ایک انگریز سا مرد تھا اور بہت شریف۔ غائب دماغ اور بے ضرر آدمی تھا۔ مگر اُس میں ایک ہی برائی تھی وہ میرے تلوے چاٹتا تھا۔"

"تلوے۔؟"

"ہاں واقعی! دن میں دو ایک مرتبہ وہ ضرور میرے ننگے تلووں پر اپنی زبان رکھ کر چاٹتا تھا۔ اُسے مزہ آتا تھا۔ مگر مجھے بڑی گھن آتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی جینس میرے قریب بیٹھی جگالی کر رہی ہے۔"

وہ زور سے ہنسی اور مسکرا کر زور سے ہنسی اُس کی ہنسی کا فوارہ مرد میں قانوس کی طرح روشن ہو اُٹھا۔

"تین ماہ کے بعد میں نے اُسے طلاق دیدی۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر چند چھچکل عاشق۔"

"اور اب؟"

"اور اب۔!" اُس نے مجھ سے کہا۔ "چلو دوسرے کمرے میں!"

جب ہم دوسرے کمرے میں پہنچے تو کمرہ فرش سے چھت تک تصویروں سے پٹا پڑا تھا۔ ایزل پر ایک ادھوری تصویر تھی۔ رنگ اور برش بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ اور

دیواروں پر چھوٹے بڑے کینوس ٹنگے تھے۔

بڑی بھیانک تصویریں تھیں اور سب میں ایک ہی چہرہ تھا اور ایک ہی جسم تھا۔ حبیبہ کا اپنا۔ کبھی چیچک زدہ۔ کبھی زخم خوردہ۔ کبھی خون اور پیپ سے لتھڑا ہوا۔ ایک آنکھ باہر نکل کر لٹکی ہوئی۔ کبھی ناک ملوسے کی طرح نرمی ہوئی۔ کبھی چیونٹیوں کی طرح چلکی ہوئی۔ کبھی ہونٹ پھٹے ہوئے۔ کبھی دانت غائب۔ کبھی ہڈیوں کا پنجر، کبھی سوکھی کھال میں ایک ایک پسلی نمایاں۔ مگر ان سب تصویروں میں حبیبہ کے سوائے کوئی نہ تھا۔

"مجھے قادر یار نے بتایا تھا۔" میں نے حبیبہ سے کہا۔ "کہ تم تصویریں بناتی ہو مگر کسی کو دکھاتی نہیں ہو۔"

"میں تمہیں یہاں تصویریں دکھانے کیلئے نہیں لائی تھی۔ اپنے شوہر سے ملانے کے لئے لائی تھی۔"

"تمہارا شوہر؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ بولی۔ "آؤ تم کو ملادوں اپنے نئے شوہر سے..."

اتنا کہہ کر وہ مجھے تصویروں سے سجے ہوئے ایک کونے میں لے گئی۔ یکایک میں ڈر کے مارے پیچھے کو ہٹ گیا۔

میرے سامنے ایک بہت بڑا پائی تھن پڑا تھا۔ بہت موٹا اور کئی فٹ لمبا اجگر۔ کنڈلی مارے ایک کونے میں نیم مدہوش لیٹا تھا۔

اُس رات حبیبہ نے ہمیں سوہو کی ایک نائٹ کلب میں سپر پر مدعو کیا تھا۔

مجھے اور میرے دوستوں کو۔ میں نے قادر یار۔ من موہن اور اُس کی بدصورت یونانی لڑکی کو مدعو کر لیا تھا۔ قادر یار اور من موہن یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے کہ میری حبیبہ ایسی عورت سے شناسائی ہے۔ جو ایک امیر و کبیر عورت ہے۔ جس کا شمار پندرہ برس تک لندن کی حسین ترین عورتوں میں ہوتا رہا ہے۔ جو کئی بار شاہی خاندان کی مہمان رہ چکی ہے۔ اُس حبیبہ نے آج ہمیں سپر پر بلایا ہے...؟"

"جی ہاں۔" میں نے ایسی سادگی سے کہا۔ جس پر فخر کا شبہ بھی ہو سکتا تھا۔

ہم لوگ وقت پر پہنچ گئے تھے۔ مگر جیبہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ مگر ہمارا ٹیبل ایک خوبصورت کونے میں سجا ہوا تھا۔ جہاں ویٹر نے ہمیں لے جا کر بٹھا دیا۔ میں نے پائی تھن والا قصہ اپنے یاروں کو سنایا۔ قادر یار تو گہری سوچ میں پڑ گیا۔ مگر من موہن کو ذرا بھی حیرت نہ ہوئی۔

"اس میں تعجب کی بات کیا ہے؟" من موہن اپنی بدصورت محبوبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔ "ہر انسان کی زندگی میں ایک مقام آتا ہے جب وہ ایک پائی تھن پال لیتا ہے۔ اپنے ماحول سے بیزاری کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آدمی جس کے ساتھ رہنے پر مجبور ہو جائے اُس کا منہ چڑاتا رہے۔ جیسے میں اس لڑکی کا منہ چڑاتا ہوں۔ بیزاری اور نفرت بھی ایک طرح کا پائی تھن ہے ہر نفرت کی دُم لمبی ہوتی ہے۔ اور اُس میں زہر بھی ہوتا ہے"

قادر یار بولا۔ "اب میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ فرائس کا قانون کہ ہر عمل کا رد عمل بھی ہوتا ہے اور برابر اُسی شدت سے ہوتا ہے۔ صرف فزکس کی دنیا ہی میں نہیں نفسیات کی دنیا میں بھی لاگو ہوتا ہے۔ جب انسان اپنے ماحول، اپنی زندگی اور عملی ترتیب سے مایوس ہوتا ہے تو باطنی توازن بگڑ جاتا ہے۔ پھر اس توازن کو سنبھالنے نے لئے اُس ذہنی تھن کو راستہ دینے کیلئے انسان کیا کیا جتن کرتا ہے۔ وہ ایک پائی تھن پال لیتا ہے، کوکین کھاتا ہے، بھیانک مصوری کرتا ہے۔ چرس کے دم لگاتا ہے۔ ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھتا ہے اور دس ہزار آدمیوں کے سامنے دو گھنٹے تک اس کرتا ہے یا بور بور افسانے لکھے چلا جاتا ہے یا ہر روز کسی نئی لڑکی سے عشق کرتا ہے۔ اور اگر اُسے یہ سب کچھ بھی نصیب نہیں ہوتا تو گھر آ کر اپنی بیوی کو گالی دیتا ہے اور اپنے بچوں کو پیٹنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

"تم نے جتنی باتیں کہیں۔" میں نے قادر یار سے کہا۔ "اُس میں سے صرف ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنے والی بات مجھے پسند آئی یعنی تھن کے اظہار کے بھی کئی طریقے ہیں۔ اپنے ماحول سے بیزاری کا اظہار کسی کو گالی دینے میں ہوں یا ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنے کی کاوش میں کیوں نہ ظاہر ہو۔؟"

"تم تو ہر بات میں سماجیت تھیسٹ لاتے ہو!" من موہن خفا ہو کے بولا۔

پھر رُخ بدل کر اپنی محبوبہ سے پوچھنے لگا۔

"پائی تھن کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"کھا جائے گا!" یونانی لڑکی بولی۔

ہم سب ہنسنے لگے۔ وہ بھی ہنسی۔ (کتنی بھیانک ہنسی تھی، کیسے میلے اور پیلے پیلے دانت تھے) پھر بولی۔

"مگر ایک طرح سے اچھا ہے۔ دوسرے لوگ ٹکڑے ٹکڑے کر کے مہینوں اور سالوں میں اپنی بیوی کو کھاتے ہیں۔ یہ پائی تھن ایک ہی جھٹکے میں جیبہ کو نگل جائے گا۔ ایک بار مرنا اچھا ہے۔ ہزار بار مرنے سے..."

کیسی خوفناک حقیقت تھی اس لڑکی کی باتوں میں۔ اُس کے چہرہ کا رنگ بدل گیا۔ اب وہ مجھے کچھ کچھ خوبصورت معلوم ہونے لگی۔ کیوں کہ ذہانت بھی چہرہ کو بدل دیتی ہے۔ پھر بدصورتی نکل جاتی ہے۔ جھرّیاں اور شکنیں غائب ہو جاتی ہیں اور عمر گم ہو جاتی ہے۔ صرف ایک روشن خیال کا روشن تاثر چہرہ پر دمکتا رہ جاتا ہے۔

جیبہ نے یہی غلطی کی۔ اُس نے اپنے حسن کا اس قدر اہتمام کیا۔ زندگی بھر وہ اپنے گالوں کے گلاب کھلاتی رہی۔ اور بھول گئی اُن گلابوں کو جو دل کی ٹہنی پر اگتے ہیں۔ جو ایک معمولی نارمل عورت کی آرزو ہے۔ محبت، رفاقت، شوہریت، ایثار، کسی میں خود کو کھو دینے کی تمنا۔ کسی کو اپنا سب کچھ دے دینے کی آرزو۔ جیبہ بھول گئی کہ عارض کے گلاب مر جاتے ہیں۔ لیکن آرزو کے گلاب سدا زندہ رہتے ہیں۔

یکایک نائٹ کلب کا دروازہ کھلا۔ اور ہم سب اُدھر دیکھنے لگے۔

جیبہ نائٹ کلب کے دروازہ پر کھڑی تھی۔

آنکھیں گہرے کاجل سے سنوری ہوئیں۔ چہرہ گہرے میک اپ سے درخشاں۔ گلے میں ہیرے کا گلوبند جگمگ جگمگ کرتا ہوا۔

اُس نے اپنا ہاتھ ایک انگریز کے ہاتھ میں دے رکھا تھا۔ جس کی عمر مشکل سے بائیس برس کی ہوگی۔

لندن کی چھٹی شام

جب حبیبہ ہماری میز پر بیٹھ چکی تو میں نے اس انگریز لونڈے کی طرف دلچسپی کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس گلفام سے تعارف تو کراؤ!"

"اس کا تعلق باپ مر چکا ہے۔!" وہ بولی۔

من موہن بولا۔ "یہ بھی ایک اچھا تعارف ہے اور اپنی جگہ پر بہت خوب ہے"

وہ بولی۔ "یہ شاعر ہے"

"شاعر چیز کیا ہے۔" میں نے کہا۔

قادر بولا۔ "میں سے بتاتا ہوں آپ شاعر کسے کہتے ہیں۔ آپ نے بھی یہ

وہ بولی۔ "یہ شاعر کہلانا پسند کرتا ہے۔ میں نہیں جانتی ہوں"

"وہ کیسے؟" من موہن نے پوچھا۔

شاعر ہونے کے علاوہ یہ پبلشر بھی ہے۔ اور انگلینڈ کے سب سے مشہور "بیٹ نک" (Beatnik) شاعروں کے دیوان چھاپتا ہے۔"

پبلشر کا نام سنتے ہی میں ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔

اب تک جتنی گفتگو ہوئی تھی۔ انگریزی کے بجائے اپنی ہی زبان میں ہوئی تھی۔ دوران وہ انگریز نوجوان دھیرے دھیرے ہم سب کی طرف دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ شرمیلی اور جھینپو مسکراہٹ تھی۔

"تھامس بلفورڈ!" حبیبہ نے اس کا تعارف کرایا۔ اتنے میں ویٹر آ گیا۔ اور حبیبہ سب کے لئے شرابوں کا آرڈر دینے لگی۔

"تم کیا پیو گے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"سنا ہے ایک ہنگرین شراب ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کا ذکر میں نے یورپی ادب میں بہت پڑھا ہے۔ جب بھی کوئی یوروپی عاشق اپنی محبوبہ کو کسی ہوٹل میں کھانے پر مدعو کرتا ہے اکثر اسی شراب کا آرڈر دیتا ہے!"

"توکئی؟" (Tokay?)

"ہاں!"

"تو آج تم توکئی پیو گے۔ جبکہ آج میں تم کو توکئی میں نہلا دوں گی۔" حبیبہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اور جھک کر اس کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا۔

"کیا بات ہے آج اس قدر خوش کیوں نظر آ رہی ہو؟"

وہ بولی۔ آج شام کی ڈاک سے مجھے میرے دو سابق شوہروں کے خط ملے ہیں۔"

"پھر۔؟"

"وہ مجھے واپس بلا رہے ہیں!"

"پھر؟"

"عجیب مسرت آمیز الجھن سی ہے۔" وہ بولی۔ "یہ جان کر خوشی ہوتی ہے کہ میں اب تک اُن کو اس قدر پسند ہوں۔ اُن کے دل میں ہوں۔ میری یاد وہ اب تک بھلا نہیں سکے۔ مگر یہ فیصلہ نہیں کر سکتی۔ کیا کروں؟ جاؤں کہ نہ جاؤں؟۔ اور جاؤں تو کس کے پاس جاؤں؟"

"اُن کے پاس جاؤ جو دونوں میں سے بدصورت ہو۔" من موہن بولا۔ "پختہ کار حسن کے قدر ایسے آدمیوں کے دل میں بہت ہوتی ہے۔"

"دونوں خوش شکل ہیں!" حبیبہ بولی۔

"تو اُس کے پاس جاؤ جو دونوں میں سے زیادہ بیمار رہتا ہو!"

"صحت دونوں کی اچھی ہے" حبیبہ نے یاس و حسرت سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"تو اُس کے پاس جاؤ۔ جو زیادہ بُرا ہو اور جس پر تم حکومت کر سکو۔" میں نے مشورہ دیا۔

"دونوں ہی بُرے ہیں اور انتہائی بیوی پرست۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟"

تھامس بلفورڈ بولا۔ "یہ کرو کہ چھ مہینے ایک کے پاس رہو، چھ مہینے دوسرے کے پاس۔ پھر کوئی فیصلہ کرو۔"

"نام۔!" حبیبہ بناوٹی غصہ سے چلائی۔ "مذاق مت کرو۔ یہ بہت سنجیدہ معاملہ ہے۔" مگر اتنا کہتے کہتے خود حبیبہ کی ہنسی چھوٹ گئی!

اتنے میں ویٹر شرابیں لے آیا۔ میں نے حبیبہ سے کہا۔

"پہلا جام تو کئی کا تم میرے ساتھ پیو۔"

"بہت اچھا۔" کہہ کر حبیبہ نے تو کئی کی بوتل اُٹھالی۔

تو کئی جام میں دھیرے دھیرے اُترنے لگی۔ جیسے کوئی حسین دوشیزہ سحر آمیز دھندلکے میں دھیرے دھیرے قریب آرہی ہو۔ جیسے کسی پرانے شاہی تاج سے نچرایا ہوا یاقوت دھیرے دھیرے بلور کے پیالے میں پگھل جائے۔ پھر کانچ سے کانچ ٹکرائے۔ تو کئی ہونٹوں سے زبان پر جانے لگی۔ ایسا لگا جیسے صبح دم سورج کی کرنیں سیال ہو گئی ہوں۔"

"ہوں۔!" حبیبہ نے ہونٹ بند کئے۔ گھونٹ کا مزا لیتے ہوئے مجھ سے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا۔

"ہوں۔" میں نے جام سے حبیبہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تصدیقی انداز میں سر ہلادیا۔

پھر یکایک روشنیاں گل ہو گئیں۔ اور ایک اسپاٹ لائٹ خالی اسٹیج پر تیرنے لگی اور نغمہ تیز ہو گیا۔

پھر اسپاٹ لائٹ نے ایک ٹیڈیوں بلاؤز اور گہرے نیلے رنگ کی جینس پہنے ہوئے ایک لڑکی کو اپنے ہالے میں لے لیا۔ ڈانس کچھ اس قسم کا تھا جیسے ایک لڑکی گہرے پانیوں میں ڈوب رہی ہو۔

پھر یکایک اسپاٹ لائٹ کے اندر ایک جال چمکا اور لڑکی پر جا گرا۔ لڑکی جال میں پھنس گئی۔ پھر پہلے اسپاٹ لائٹ کے کچھ فاصلے پر دوسرا اسپاٹ لائٹ کا گھیرا نظر آیا۔ اس اسپاٹ لائٹ کے اندر ایک رقاص مچھیرے کا لباس پہنے کھڑا تھا۔ اور تھرکتے تھرکتے جال کھینچ رہا تھا۔

لڑکی جال میں اُلجھی ہوئی، اُلجھے ہوئے بھاؤ بناتی ہوئی، ناچتی ہوئی، دھیرے دھیرے مچھیرے کی طرف کھسکتی جارہی تھی۔

پھر دونوں اسپاٹ لائٹ ایک ہو گئے۔ اور جال مچھیرے کے ہاتھ میں آگیا۔

مچھیرے نے مچھلی کو دیکھا۔ جال سے نکالا۔ مسکرایا، اُس کے گرد ناچا۔ پھر اُس نے مچھلی کو ہاتھ لگایا۔ مچھلی تڑپ کر الگ ہو گئی۔ مچھیرے کو غصہ آیا۔ اُس نے پھر پکڑنا چاہا۔ مچھلی پھر پھسل گئی۔ گت تیز ہو گئی۔ مچھیرے نے چاقو نکال لیا اور غصہ سے آگے بڑھنے لگا۔ اور مچھلی کے گرد چکر کاٹنے لگا۔ ہر بار مچھلی اُس کے ہاتھ سے، اُس کے چاقو کے وار سے بچ جاتی تھی۔ تماشائیوں کی سانس تیز ہو گئی یکایک چاقو کا ایک وار لڑکی کے شانے پر پڑا۔ اور شانے سے خون بہنے لگا۔ اور اُس کا بلاؤز شانے سے پھٹ گیا۔ پھر دوسرے شانے سے بلاؤز پھٹ گیا۔

پھر مچھیرے نے ناچتے ہوئے چاقو زمین پر گرادیا۔ اور بڑی تیزی سے ناچتے ہوئے اُس نے مچھلی کو چیخ مار کر دبوچ لیا۔ اپنے ناخنوں سے اُس نے مچھلی کے بلاؤز کو جگہ جگہ سے پھاڑ ڈالا۔ لڑکی نے اپنے ننگے پستان نمایاں اور مست ہو کر اُس کی بانہوں میں ناچنے لگی۔ ناچ کے آخری چکر پر مچھیرے نے ایک وحشیانہ جھٹکے سے ادھ ننگی لڑکی کو اُٹھا کر اپنے کاندھے پر لادلیا اور تاریکی میں غائب ہو گیا۔

ایک لمحہ کیلئے ہال میں سناٹا رہا۔ پھر تماشائی زور زور سے تالیاں بجانے لگے۔ نغمہ

ختم ہو گیا۔ ہال کی روشنیاں واپس آ گئیں۔ روشنیاں واپس آتے ہی میں نے دیکھا، قادر یار رومال سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ رہا ہے۔

نائٹ کلب سے نکل کر ہم نے مشورہ دیا۔ "رات ابھی جوان ہے۔ کیوں نہ اب کرانگ۔ (Pub-Crawling) کی جائے"

سب نے اس تجویز پر صاد کیا۔ پب کرانگ بہت آسان ہے۔ بہت مہنگا، کم بے حد مزے دار کھیل ہے۔ ایک پب یعنی شراب خانے سے دوسرے شراب خانے میں جاتے ہیں۔ اور پھر دوسرے پب اور خصت ہو جاتے ہیں۔

"ایک شرط پر۔!" میں نے کہا۔ "میں صرف توکلی پیوں گا۔"

"تم ہی نہیں سب توکلی پئیں گے۔" نام بولا۔ "اور آج کی رات کی توکلی کا سارا خرچ میرے ذمے ہے!"

پہلا پب جو ملا وہ عجیب و غریب تھا۔ یعنی ایک تہہ خانے کی سی صورت میں جہاں شراب رکھی جاتی ہے (لندن میں ایسے کئی پب ہیں) بیچوں بیچ محرابوں کے اسٹول اور میز کا سلسلہ تھا۔ جس میں بیٹھا جاتا ہے۔ اور سر کے اوپر کئی شیشوں کی الماریوں میں طرح طرح کی شرابیں سجی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار سے ایک چوڑی پٹی لگی تھی۔ جس پر لوگ اسٹولوں پر ٹانگیں لٹکائے ہوئے اکٹھے شراب پی رہے تھے۔

جب توکلی آئی تو میں نے نام سے پوچھا۔ "یہ وہسکی تو خاصی تھی۔"

"یہ خاصی تھی۔" نام نے کہا۔ "مگر یہ ایک خاص قسم کی وہسکی تھی۔"

میں نے کہا۔ "اس پب میں ہر قسم کی وہسکی ہے۔ پہلے شراب والے ان کی بوتلیں لے آتے تھے۔ اب ان کی بوتلیں ان کے گاہک لے آتے ہیں۔ یہ گاہک اپنے گھروں سے بوتلیں لے آتے ہیں۔ پھر یہ شراب والے ان بوتلوں میں سے تھوڑی تھوڑی شراب نکال کر اپنے گاہکوں کو پلاتے ہیں۔ اس طرح ہر شام کو ان بوتلوں میں شراب کی مقدار کم ہوتی جاتی ہے۔ اور ایک دن ایسا آتا ہے کہ بوتل خالی ہو جاتی ہے۔ اور اس پر گاہک کا نام لکھ کر اسے شیلف پر رکھ دیا جاتا ہے۔ اگلی بار جب گاہک آتا ہے تو اس کی بوتل اس کے سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ اور وہ اس میں سے اپنی مرضی کی شراب پیتا ہے۔"

سے خون نہ نکلے، دیکھنے والوں کی تسکین نہیں ہوتی۔ اگلا قدم کیا ہوگا۔؟

"شاید روم کے Gladiators کی طرح تماشے ہوں گے۔ جس میں نقلی خون نہیں نکلے گا۔ اصلی شیر سے اصلی آدمی کو لڑا دیا جایا کرے گا۔ اور جب شیر آدمی کو پھاڑ پھاڑ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ تو رومنوں کی طرح اسٹیڈیم میں بیٹھے ہوئے ہزاروں تماشائی فرط مسرت سے اُچھل کر تالیاں بجایا کریں گے۔" قادر یار تلخی سے بولا۔ "وہ۔ اقبال نے جھوٹ نہیں کہا تھا... یہ تہذیب اپنے ہی خنجر سے خودکشی کرے گی۔"

"اس ایٹمی تہذیب پر کیا موقوف ہے۔ ہر تہذیب کا زوال یونہی شروع ہوتا ہے۔ یاد کرو وہ انسانی کھوپڑیوں کا مینار جو چنگیز خاں نے بنایا تھا۔ اور دور کیوں جاؤ اپنے ہی وطن ہندوستان میں یاد کرو وہ زمانہ۔ وہ وش کنیاؤں کا زمانہ۔ مشرق نے بھی وحشت اور بربریت سے باب میں ستے کیسے نازک گل بوٹے ابھارے ہیں۔" من موہن بولا۔

"وش کنیا کس کو کہتے ہیں؟" نام نے پوچھا۔

"اپنے عظیم اقتدار کے زمانہ میں جسے ہم لوگ اپنی تاریخ کا سنہری نیک کہتے ہیں۔ ہندوستان کے بڑے بڑے مہاراجہ وش کنیائیں پالتے تھے۔

ایک خوبصورت لڑکی کو لے کر اسے بچپن ہی سے زہر کھانے کی تربیت دی جاتی تھی۔ پہلے افیم اور دھتورے سے شروع کرتے ہوئے ہولے ہولے اُسے سنکھیا تک پہنچایا جاتا تھا۔ پھر سنکھیا سے بعد اُسے ہولے ہولے کمزبر والے سانپوں سے کٹوایا جاتا تھا۔ پھر کمزبر والے سانپوں سے دوزبانہ خطرناک زہر والے سانپوں پر آتی تھی اس تربیت کے دوران کئی لڑکیاں مر بھی جاتی تھیں۔ مگر دو تین ایسی بچ جاتی تھیں جو خطرناک سے خطرناک زہر ہضم کر جاتی تھیں۔ پھر ایک مقام وہ آتا تھا، جہاں پر وش کنیا سانپ کو کاٹتی تھی اور وش کینا کے زہر سے سانپ مر جاتا تھا۔"

"ناممکن۔!" نام حیرت سے بولا۔

"تاریخ میں بار بار وش کنیاؤں کا حوالہ ملتا ہے۔ جس لڑکی کے کاٹنے سے سانپ

مر جائے وہ صحیح معنوں میں وشکنیا بن جاتی تھی۔ یہی حسین و جمیل لڑکیاں رقص و موسیقی کے باب میں بھی طاق کر دی جاتی تھیں، اور مردوں کو لبھانے کے سب منتر انہیں سکھا دیے جاتے تھے!"

"پھر۔؟" ٹام نے پوچھا۔

"پھر اپنے دشمن کو ختم کرنے کے لئے یہ وشکنیا کسی طرح سے اس کے پاس بھجوا دی جاتی تھی۔ جہاں وشکنیا اُس مرد کو اپنی محبت میں الجھا کر اُسے اپنی طرف مائل کیا، ختم۔ پہلے ہی بوسے میں ختم۔"

"اوہ!" ٹام نے تعریفی لہجہ میں کہا۔ "مغرب آج بھی مشرق کے مقابلہ میں اس قدر crude ہے۔!"

حسن میں شرابیں تو وہی ہوتی ہیں۔ مگر پیمانہ کا فرق اور اس کی سجاوٹ مختلف ہوتی ہے۔ پیاک بار میں شراب کا مینو ہندوستانی تھا اور دیواروں پر ہندوستان سے جنگلوں سے شکار کئے گئے جانوروں کے سر لٹکے تھے۔

ان دیواروں پر ان ہندوستانیوں کے سر لٹکا دیے گئے تھے جنہیں انگریزوں نے آزادی کے نام کی پرواہ میں پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔ "اس پیمانہ اور انگریزی سلطنت کی تاریخ مکمل ہو جاتی!" میں نے کہا۔

"ہش!" من موہن نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "کیوں پارٹی کا لطف کرکرا کرتے ہو؟"

میں چپ ہو گیا۔

پیاک بار میں میری ملاقات ایک نئے سے ہوئی۔ چہرہ صاف۔ کنپٹیوں پر سفید بال۔ عمدہ لمبوترا مسکراتا ہوا شرٹ پہنے ہوئے اور کھلتا ہوا۔ چند ہندوستانیوں کو دیکھ کر وہ ہمارے پاس آ بیٹھا اور بہت جلد ہم سے گھل مل گیا۔ وہ ایک انگریز تھا۔ اور آزادی سے پہلے وہ ہندوستان کا نشنر تھا۔

"میں روزرات کو اسی بار میں آتا ہوں۔" اس نے مجھے بتایا۔

"ہاں"

"وہ تمہیں بہت یاد آتا ہے۔"

"اسے اصلعت بہت عزیز ہے۔" میں نے اُس سے کہا۔

"وہ اصلعت بہت اعلیٰ ہے۔" وہ بولا۔

"ہاں بہت اعلیٰ زخموں پر نمک مت چھڑکو!"

مذاق نہیں کرتا ہوں۔" ایرک بولا۔ "بہت سنجیدگی سے سوچ سمجھ کر کہتا ہوں اور تمہارے ملک کی غریبی اور اپنے ملک کی امیری کا مقابلہ کر کے کہتا ہوں کہ [illegible] ملک میں مشینیں بہت ہیں۔ [illegible] تم مشینوں کو [illegible] ہیں دیکھو۔ یہاں تمہارے [illegible] ہے۔ [illegible] پھلی اور آلو نے [illegible] ہیں وہ [illegible] اور باندی کے کباب اور دھاگے سے [illegible] ایک [illegible] چپٹ پٹے کپڑوں کے نام گنوا دیے۔ [illegible]

"[illegible] کھاتے ہیں؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"[illegible] ہے غریب ملک ہے۔ مگر ہندوستان میں آج بھی تم دو آنے کے [illegible] پیٹ بھر کھا سکتے ہو۔ پیٹ آنے میں لاکھی سا بھر۔ سادہ دو سادا اور ڈاکھا کر مزے [illegible] آنے میں ویشنو تھالی آتی ہے۔ جس میں تین طرح کی [illegible] آنے میں [illegible] نہیں کر سکتے۔ سردیوں میں باتھ [illegible] سے پہلے بھی کاش سے نیٹ میں ایک شخص ڈالتا [illegible] اور تمہاری [illegible] ہے۔ [illegible] میں [illegible] سورج [illegible] ہیں۔ اور ترس جاتے ہیں سورج کی ایک کرن کو۔ [illegible] شراب پیتے ہیں۔ اور ترس جاتے ہیں سورج کی ایک کرن کو۔

اور مہینوں نہا نہیں سکتے اور اندر سے وہی غلیظ انڈر ویئر پہنے اوپر سے ہاتھ منہ دھو کر۔ کریم پاؤڈر سے اپنے اندر کی غلاظت چھپانے کیلئے مجبور ہیں مجھے روہیل کھنڈ کی ندیاں یاد آتی ہیں۔ جہاں میں کسی بھی موسم میں نہا سکتا تھا اور کھلے آسمان کے نیچے سو سکتا تھا۔

اور کپڑا کتنا سستا ہے تمہارے ملک میں۔ وہاں میرے پاس درجنوں سوٹ تھے۔ اور الماریاں بھری ہوئیں تھیں کپڑوں سے۔ یہاں میرے پاس دو سوٹ ہیں۔ ایک دن کو پہننے کیلئے۔ ایک رات کو بار میں جانے کیلئے۔ اور صرف تین قمیصیں۔ سمجھتے ہو۔ صرف تین قمیصیں اور دو سوٹ۔ اور اسی میں ایک عام کھاتے پیتے انگریز کی زندگی گزر جاتی ہے۔ برف کی طرح باسی ٹھنڈا گوشت۔ سال بھر سے ڈیپ فریز Deep Freeze میں رکھا ہوا۔ اور آلو۔ صبح آلو۔ دوپہر آلو۔ شام آلو۔ اور رات کو آلو۔ آلو کھا کھا کر میرے سارے جسم میں نشاستہ بھر گیا ہے۔ اور کہاں ہیں وہ تمہارے ملک کے دسہری۔ اور الفانزو لنگڑا اور سفیدہ، چونسہ اور ثمر بہشت۔ تمہارے ملک میں ایک غریب سے غریب آدمی بھی جنگل کے آم کھا کر چار مہینے زندہ رہ سکتا ہے۔

اس یخ بستہ رات کو دیکھو جسے الکوحل کی مصنوعی گرمی سے پگھلایا جا رہا ہے۔ پھر للعلو کی گرم شاموں کو یاد کرو۔ جب ان سے سوندھی سوندھی مٹی کی بو آتی ہے اور سفید براق چکن کے کرتے اور سپید بھک پائجامے پہنے مرد ہفتہ گزارتے ہیں۔ اور بیگمات نیلے، پیلے، اودے، نارنجی غرارے پہنے ہوئے شامتہ العنبر کی خوشبو لگائے ہوئے پھولوں کی طرح مہکتی ہوئی ہاتھ بڑھا کر پان پیش کرتی ہیں۔ اور دور اوپر آسمان میں پتنگ اڑتے ہیں۔ اور سر سے ہرے ملوٹے پنکھ پھیلائے خوشی سے چہچہاتے ہوئے اڑتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہاں کی فضا میں مردہ ریڈیو زور زور سے چلاتا ہے۔ ایٹم بم۔ راکٹ، مزائیل، زہریلی گیس... تم سے اپنی زندگی بچے...!"

ایرک نے جام خالی کر دیا۔ بڑی دقت سے اس نے میرے گال پر ہاتھ مارا اور بولا۔

"جینا واپس جا کر اپنے وطن کی دھرتی کو میرا سلام کہنا۔ میں نے تمہارے وطن کو تمہارے وطن کے چھوڑنے کے بعد پیار کیا ہے...!"

اور تھیٹروں، ادیبوں، اور موسیقاروں کا اڈہ ہے۔ جب ہم پہنچے تو کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پھر بھی لوگوں نے ہمارے لئے جگہ خالی کر دی۔ اب رات گہری ہو چکی تھی شراب کا رنگ چوکھا تھا۔ اور زبانیں کھل گئی تھیں۔ انگریز کی زبان بڑی دیر میں کھلتی ہے۔ مگر بالآخر کھل جاتی ہے۔ ایک نوجوان ادیب جو شکل و صورت سے بیٹ لگ معلوم ہوتا تھا۔ بڑے زور سے ہاتھ چلا کر ایک معمر ادیب سے کہہ رہا تھا۔ "ٹی۔ ایس ایلیٹ از اے فراڈ۔" T.S. Eliot is a Fraud

"آف کورس۔" اس کی بغل میں بیٹھی ہوئی ایک لڑکی نے اسی شدت سے کہا۔ اس کی سنہری سے سورنی بلب بال اس کے شانوں تک لہرا رہے تھے۔ میں صرف اس کا رخ دیکھ سکتا تھا اور وہ رخ بہت خوبصورت تھا۔

"ٹی ایس ایلیٹ کا فلسفہ ہمارے فلسفہ سے میل نہیں کھاتا۔" وہ نوجوان ادیب پھر بولا۔ "میں مانتا ہوں، جیسا کہ بدھ نے کہا ہے کہ پہلی سچائی غم ہے، یہ اس بات کو کہنے کا دوسرا طریقہ ہے کہ آخری سچائی بھی غم ہے۔ مگر پہلے غم سے آخری غم کی طرف جاتے ہوئے بیچ میں حیات کا جو وقفہ آتا ہے کیا اس کے دھندلکے میں خوشیوں کے شرارے نہیں چھپتے ہیں اگر غم ہے تو کہیں پر خوشی بھی ہوگی۔ خوشی حیات کی تخلیق ہے۔ گلاب سے پھول کی خوشی جو اسے کھلنے سے حاصل ہوتی ہے۔ چڑیا کے پھدکنے کی خوشی انسان کی محبت کی خوشی ٹی ایس ان سب سے منہ موڑ کر صرف غم کا Waste Land دکھایا ہے جو حقیقت کا صرف ایک رخ ہے۔"

"آف کورس۔" لڑکی پھر بولی۔

"یہ آف کورس کہنے والی لڑکی کون ہے؟" میں نے جیمز سے پوچھا۔

"یہ تھی گنور۔ نئی نسل کی ایک انگریز شاعرہ ہے۔"

"یہ حقیقت کا تم بھی اعتراف کرتے۔" وہ بڈھا ادیب بولا۔ "کہ ٹی۔ ایس

نے اس عہد کو ایک عظیم شاعرانہ آہنگ سے پیش کیا ہے۔ وہ ذاتی مجہولیت اور انتشار جو دو جنگوں سے پیدا ہوا۔ وہ مایوسی، نفرت اور خوفناک انسانی اقتدار سے انحراف جو ہمارے عہد کا خاصہ ہے۔ محض خوشی کی تفسیر میں تمام اچھی حقیقت و کہاں چھپا کے لے جاؤ گے۔ جس نے Waste Land اور Hollow Man کو جنم دیا ہے۔"

"جیسا میں نے کہا۔" دو نوجوان ادیب بولا۔ "میں غم سے انکار نہیں کرتا۔ میں مایوسی، تھکن اور انتشار سے انکار نہیں کرتا میں تو صرف اس حقیقت کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر غم ہے تو کہیں پر خوشی بھی ہوگی۔ ورنہ غم کے معنی کیا۔ اور غم بذات خود اس امر کی شہادت ہے کہ کہیں پر انسان نے خوشی چھپی ہے۔ مایوسی انتشار اور انسانی قدروں سے انحراف اس بات کا یقینی ثبوت ہیں کہ کہیں پر امید باقی ہے۔ شاید طمع کا وجود ہے۔ انسانیت کی رجائیت کہیں پر آج بھی زندہ ہے!"

"کہاں پر؟"

"میرے سینے میں!" نوجوان ادیب اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔

"تمہارے سینے میں اور ڈورا کے سینے میں۔" نوجوان ادیب ڈورا تھی گنور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہاں اور تمیوز میں جینے سے ہر فرد کے سینے میں خوشی۔ ایسی کے سینے میں محبت حیات کا جذبہ اپنا تھا۔ ورنہ تاجرانی کا مطلب یہ ہے۔ مایوسی مکمل ہے تو پھر انسان زندہ کیوں رہے، خودکشی کیوں نہ کرے۔ Criterion کیوں شائع کرے۔ ٹی۔ ایس کی طرح ایک چھوڑ دو شادیاں یہاں نے فیبر اینڈ فیبر میں ملازمت یوں کرے رہنے میں کا کیا مطلب ہے۔ انسانی تبلیغ کرنے والے ہر قدم پر اپنے کردار سے اپنے فلسفہ کی تکذیب کرتے ہیں۔"

"آف کورس۔" ڈورا بولی۔

کسی دوسرے کونے سے ایک سریلی، اداس بھی والے نے یہ گیت گانا شروع کر دیا ہے ہولے ہولے گانے لگے۔ اور ہولے ہولے بہت سے لوگ اس گیت میں شریک

ہو گئے اور بحث گیت میں ختم ہو گئی۔

جیسے ہی ملبورن کی بغل میں ہٹ گئی۔ میں نے دیکھا وہ سب سے نظریں بچا کر دھیرے دھیرے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں سے لگا رہی تھی۔ نام ملبورن چیختا چلا جا رہا تھا اس کا منہ جیسے ہی لہر میں اینٹ پڑا تھا۔ جیسے کسی خالی بوتل کو پکڑے ہوئے ہو۔

چند لمحوں سے بعد بحث کرنے والے معمر ادیب نوجوان ادیب اور ڈورا تھی گنور نے نام ملبورن کو ہلا لیا اور وہ لوگ اپنی جگہ سے اٹھ کر ہماری طرف آ گئے۔ اور تعارف ہوا۔

"یہ ڈورا تھی گنور ہے۔"

"یہ سیموئیل مائیکو (نوجوان ادیب) یہ ارنسٹ جانسن (معمر ادیب)"

"ہاؤ ڈو یو ڈو ... ہاؤ ڈو یو ڈو۔"

"میں آپ کی بات بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا۔" میں نے نوجوان ادیب سے کہا۔ "آپ غالباً مارکسی ہیں۔"

"نہیں!" وہ نوجوان ادیب بولا۔ "میں مارکسی بیف تک ہوں۔"

"ایسے۔" میں نے حیرت سے کہا۔ "یہ نئی نسل کی کونسی نئی قسم نکلی ہے۔ کہو۔ آف کورس!" میں نے ڈورا تھی گنور سے کہا۔

وہ یا ایب خفیف سا ہنس پڑی۔ اور بڑی بے تکلفی سے میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اور پوچھنے لگی۔

"تم کس زبان میں شاعری کرتے ہو؟"

وہ معمر ادیب میرے جواب دینے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "اصل حقیقت یہ ہے کہ انگریزی انشلڈ ابھی تک اپنے پر لگے نقصان کو ہضم نہیں کر سکا ہے۔ اس کا دماغ مل یا۔ ایلیٹ پہلی جنگ عظیم کی تباہی کی پیداوار ہے تو سیموئیل semuel mantiguo دوسری جنگ عظیم کے نقصان کی۔ دونوں الگ الگ زبان بولتے ہیں۔ خیالات ایک ہی کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایلیٹ کو ایک طرح سے اپنے

عہد سے شکوہ ہے اور وہ ماضی کو لوٹ جانا چاہتا ہے اور تیمو لوپرانی نسل سے شکوہ ہے۔ اس نے برطانوی سلطنت یوں کھودی۔ مگر وہ یہ بات بھی ہے کا نہیں"

"نہیں۔!" اب تیموتھی مائیکو بھتے اور سنجیدہ لہجہ میں بول رہا تھا۔ "شکوہ تو مجھے بھی ہے اور اپنے عہد سے ہے جس نے ہمیں اس قدر الیا زدہ دیا ہے ہم خوشی سے مزور دھاگے سے لٹکے ہوئے چاروں طرف ہاتھ پاؤں مارتے ہیں جہاں غم سے ہاتھ نہیں ملتے۔ مگر ہم اپنی تلاش جاری رکھیں گے۔ کہ کیا اس کائنات میں غم نے علاوہ بھی کچھ نہیں ہے"

میں نے کہا۔ "ابھی میں غم کو مصیب سمجھتا تھا۔ اور اس سے آنکھیں چراتا تھا۔ اور اس کی ہستی کا منکر تھا۔ مگر اب غم کی اصل حقیقت بھی خوشی کی اصل حقیقت کی طرح میرے سامنے آچکی ہے۔ اب میں غم کو تسلیم کرتا ہوں اور اسے گلے سے لگاتا ہوں مجھے اس عہد سے یہ شکوہ نہیں ہے کہ اس نے ہمیں مولی مولہ غم نہیں دیا۔ ایسا دل گداز غم۔ جیسے محبوب کے کھو جانے پر ہوتا ہے۔ یہ ایک بعد مطلق آنسو کی روانی کا غم بھی مولی غم ہے۔ جس سے وہ تباہی انسانی آبادی کی روح کو آنسو کی دلدل میں دھنستی چلی جارہی ہے۔"

"ارے محرومی وہ تو تاروں کی محرومی تھی۔ یہ پیار کرنے کی محرومی بھی مولی محرومی ہے۔ اس عہد سے مجھے بھی شکوہ ہے۔ اس نے انسان کو مولی بہت بڑا غم نہیں دیا۔ مولی بہت بڑا جھوٹ نہیں دیا مولی خوبصورت محرومی اور تسکین نہیں دی۔ اس نے ان کی زیادہ سے زیادہ بھی دیا۔ کسی کی روح کو چھین لی۔ کسی کو تحفظ سے پہلا دیا۔ اسے یہ تو نہایت حقیر، کمینہ، تنگ نظر اور چھچھورا غم ہے جو تمہارے سماج اور نظام کی غلاظت کو بے نقاب کررہا ہے۔

ارے میں ہوں تمہاری جگہ۔ تو یوں کروں کہ انسان کو ستاسے بھی بڑے غم کا احساس کرے۔ کیونکہ ان کے سارے جواہر حسیت کو اس سے زیادہ بڑا غم محسوس نہ ہے جیسے وہ قحط یا تحریر ہے اور اس کی تسکین میں ان دن

بھی وہ اپنے آپ کو غریب محسوس کرے۔ ارے غم دیتے ہو تو کوئی ایسا غم تو دو جو انسان کے شایان شان ہو!"

رات آخری دموں پر ہے۔ آسمان کی سطح سیمیں ہو چلی ہے دور تھی کی آنکھیں صبح کے ستاروں کی طرح چمک رہی ہیں۔ میں اُسے گھر تک پہنچانے آیا ہوں اور پورچ کے ستون کی آڑ میں اُس کا بوسہ لیتا ہوں۔

"شب بخیر!"

"شب بخیر!"

دور تک بھی تک میری بانہوں میں کانپ رہی ہے اور مجھے خیال آتا ہے وقت کے ترش سے چرائے ہوئے ان لمحوں کا کسی پورچ کے ستون کے پیچھے۔ کبھی کبھی پورنیکو سے مائے میں، کبھی نیم اندھیرے میں خوشبو دیتی ہوئی گلاب کی ڈالیوں کی آڑ میں۔ وہ زندہ تابندہ لمحے جب ایک انسان دوسرے انسان کو پہچان کر اسے مسرت نامعلوم بھیجتا ہے خوشی وقت نہیں دیتا ہے خوشی تو انسان کی اپنی تخلیق ہے۔!!!

لندن کی ساتویں شام

کیٹ سے میری ملاقات بہت پرانی ہے۔ ایک دفعہ ۱۹۷۲ء کے گلرگ کے سیزن میں میری ملاقات فیروز پوری نالے پر ہوئی۔ یہ نالہ گلرگ کے نیچے بہتا ہوا ایک خطرناک جگہ پر ایک گہری ڈاب بناتا ہے۔ کیٹ کو میں نے اسی ڈاب میں سے ایک بوڑھے انگریز مرد کو نکالتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ جگہ آبادی سے دور دو پتھریلے پہاڑوں کے بیچ واقع تھی اور مجھے سیر کرنے کے لئے ایسی جگہیں بہت پسند آتی ہیں۔ جب سورج ڈوب رہا ہو۔ اور دھند پھیل رہی ہو اور خنکی بڑھ رہی ہو۔ اور سائے بکھر رہے ہوں اور رات کو خوشبو نزدیک آتی جا رہی ہو۔ ایسے میں مجھے کسی محبوب کی آمد کا گمان ہوتا ہے۔ ایسے میں مجھے اکیلے، سنسان اور اُجاڑ جگہوں پر سیر کرنا اچھا لگتا ہے۔ شاید اگلے موڑ پر وہ نظر آ جائے۔ وہ کون؟

وہ تو نظر نہیں آئی۔ البتہ میں نے کیٹ کو دیکھ لیا۔ جو ڈاب کے گہرے پانیوں میں گویا کسی مگرمچھ سے لڑ رہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا ڈاب کے کنارے چلا گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹھکی۔ پھر زور سے چلائی۔ "پانی میں آ جاؤ۔ ڈوبنے کو بچا لو۔"

میں نے اُس سے کہا۔ "مجھے تیرنا نہیں آتا۔"

میری بات سُن کر اُس نے زیرِ لب کچھ غصہ سے کہا۔ پھر وہ کوشش کر کے ایک بوڑھے انگریز مرد کے جسم کو کنارے پر لے آئی۔ مرد بڈھا تھا اور کیٹ بہت خوبصورت تھی۔ اُس کا ننھا ہوا، چکنا ہوا، مچھلی کی طرح پھسلتا ہوا جسم بے حد حسین تھا۔

"تمہیں تنفس جاری کرنا آتا ہے؟" اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں۔"

اُس نے پھر زیرِ لب مجھے ایک گالی دی۔ پھر بڈھے کے جسم کے پھیپھڑوں میں تنفس کا عمل جاری رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ میں بڈھے کی نبض دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر بے سود۔ بڈھا مر چکا تھا۔

یہ تھی کیٹ سے میری پہلی ملاقات۔ پورا نام کیتھرائن ہالووے تھا۔ وہ اُس بڈھے انگریز کی سٹینو گرافر تھی۔ جیسا کہ مجھے بعد میں پولیس کی تفتیش کے دوران معلوم ہوا۔ بڈھا انگریز ریزیڈنسی میں ملازم تھا۔ اُس کی بیوی دو سال ہوئے مر چکی تھی۔ بڈھا خاصا بہت امیر تھا۔ لندن میں اُس کی خاصی جائیداد تھی۔ پانچ سال کے بعد وہ پنشن لے کر واپس وطن جانے والا تھا۔ میری طرح اُسے تیرنا نہیں آتا تھا۔ اُس وقت وہ ڈاب کے کنارے کے پتلے پانیوں میں نہا رہا تھا۔ (یہ کیٹ کا بیان تھا) اور وہ چونکہ تیرنا جانتی تھی۔ اس لئے وہ ڈاب کے اندر جا کر نہا رہی تھی۔ دونوں ننگے تھے۔ اتنے میں نہاتے نہاتے رچرڈ ہالووے کا پاؤں پھسلا اور وہ گہرے پانیوں میں اُتر گیا۔ جب تک کیٹ تیرتے تیرتے اُس کے پاس پہنچے۔ وہ کئی بار غوطے کھا کر ڈوب چکا تھا۔ آگے جو کچھ ہوا اُس کا گواہ میں تھا۔!

پولیس کو شبہ ضرور ہوا۔ اور سچ بات یہ ہے کہ شبہ مجھے بھی ہوا تھا۔ وہ تصویر بار بار میرے ذہن میں گھومتی ہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے نالے کی اُس گہری ڈاب میں ایک لڑکی ایک غوطے کھاتے ہوئے مرد کو اور غوطے دے رہی ہے۔ مگر کیٹ نے مجھے بتایا اور پولیس کو بھی کہ ایسا نہیں تھا۔ وہ اُسے پانی سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی مگر لڑکی آخر لڑکی ہے وہ کیسے اُسے بچا سکتی تھی۔ اُسے جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ کیٹ نے رو رو کر مجھے بتایا اور روتی ہوئی لڑکیاں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ آنسو شبنم کی طرح پلکوں پر چھلکتے ہوئے۔ نیلمیں پھولوں کی طرح کھلی ہوئیں۔ گلابی ہونٹ فرطِ غم سے ذکھ سے کانپتے ہوئے۔ مجھے ایسی لڑکیوں پر بہت رحم آتا ہے۔ پیار بھی آتا ہے۔ اور ایسی

پگھلی ہوئی کیفیت میں لڑکیاں پیار بھی کر لیتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرسری تحقیقات کے بعد پولیس نے کیٹ کو بے گناہ قرار دیا اور کارونر نے فیصلہ دیا کہ مقتولہ کی موت اتفاقیہ ڈوب جانے سے ہوئی۔

ممکن ہے میرے بیان کے باوجود معاملہ آگے بڑھتا۔ مگر وہ دن انگریزوں سے ہندوستان سے چلے جانے کے دن تھے۔ عجیب افراتفری اور بھگدڑ کے دن تھے۔ ریزیڈنسی میں فائلیں جلائی جا رہی تھیں۔ سامان باندھا جا رہا تھا۔ ایسے میں اس واجبی بڈھے لاوارث انگریز کے مرنے کی فکر تھی۔ جو مر گیا سو مر گیا اور جب انگریزی راج ہی مر گیا تو ایک فرد کی موت پر اس قدر واویلا مچانے سے کیا ہوتا۔ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اور کیٹ مجھے اپنا ایڈریس دیے بغیر اور آخری بار ملے بغیر پاکستان چلی گئی۔ اور میرے ذہن میں کچھ شبہے چھوڑ گئی۔ چند برسوں اور شاداب جسم کا رنج ہوا اس چھوڑ گئی۔ پھر میں بھی اُسے بھول گیا۔

آج اتنے برس کے بعد وہ اچانک مجھے لندن میں مل گئی۔

یہ لندن میں میرا آخری دن تھا۔ میں کرسٹی کورٹ سے پیشتر تھامس جلوہ سے ملاقات کر کے لوٹ رہا تھا۔ کہ مجھے ایک دیدہ زیب خوش لباس عورت اپنے گھر کے سامنے کے چھوٹے سے خوشنما باغیچے سے نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ باغیچہ کا دروازہ بند کر رہی تھی اور میں اُس کے خوشنما گھنے ہوئے بالوں اور اُس کی پشت کی جامہ زیبی کو دل ہی دل میں سراہ رہا تھا۔ کہ اتنے میں وہ دروازہ بند کر کے میری جانب مڑی اور بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

"کیٹ۔!!"

وہ ٹھٹھکی، چند لمحے غور سے مجھے دیکھتی رہی۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ یا یہ فیصلہ کر رہی ہو کہ اس ہندوستانی کو پہچانا جائے یا نہیں۔

چند لمحوں کی کشمکش کے بعد یا تو اُس نے مجھے پہچان لیا یا کوئی فیصلہ کر لیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ بڑے پُروقار طریقے سے مسکراتی اور [illegible] اس نے اپنا ہاتھ

جس پر ایک بیش قیمت دستانہ چڑھا ہوا تھا مجھے مصافحہ کے لئے پیش کر دیا۔ جسے میں نے فوراً تھام لیا۔!

"تو... تو...!" وہ میرا نام لے کر بولی۔ "تم یہاں کہاں؟"

"اتنے برسوں سے تمہیں ڈھونڈھ رہا ہوں۔" میں نے اُس سے کہا۔ "وہ لڑکی جو مجھے ہندوستان میں ترستا ہوا چھوڑ آئی تھی۔ آخر اُسے میں نے آج لندن میں پا ہی لیا۔ تم تو پہلے سے بھی خوبصورت ہو گئی ہو اور کچھ شادی شدہ سی بھی۔"

"شادی تو میں نے نہیں کی۔" کیٹ بولی۔ "مگر یہاں پر میں مسز کیتھرائن رتھینڈ کے نام سے مشہور ہوں۔" کیتھرائن نے ذرا ہٹ کر مجھے دروازہ کے نام کی تختی پڑھنے دی۔

"... کیتھرائن رتھینڈ!"

"میرا خیال ہے..... مسٹر رتھینڈ کی کوئی بیوی تھی۔"

"وہ تو مسز رتھینڈ کی موت سے دو سال پہلے مر چکی تھی۔ اس کے بعد۔ بعد۔" وہ زک زک کر بولی۔ "ہم دونوں اکٹھے رہتے تھے۔ میاں بیوی کی طرح گو میں نے وہاں کسی کو بتایا نہیں تھا۔ پھر مسٹر رتھینڈ اپنی ساری جائیداد بھی میرے نام چھوڑ گئے تھے اس لئے میں نے اُن کا نام بھی لے لیا۔"

"آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔؟ بہت اچھا کیا تم نے۔" میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ جن کا رنگ گہرا عنفشی ہوتا جا رہا تھا۔

"مجھے اپنے گھر نہیں بلاؤ گی؟" آخر چند لمحات کی خاموشی کے بعد اُس کی بے چینی دیکھ کر میں نے کہہ ہی دیا۔

وہ اپنے پرس کے پھندنے کو موڑتی ہوئی، آنکھیں جھکائے کمزور آواز میں بولی۔

"اس وقت تو میں کام سے باہر جا رہی ہوں۔ آج شام تم کیا کر رہے ہو؟"

"آج شام تو دوسری جگہ مدعو ہوں البتہ لنچ کے لئے فارغ ہوں۔" میں نے بے تکلف ہوتے ہوئے کہا۔ کیوں کہ ایسے معاملوں میں میں ڈھیل دینے کا قائل نہیں

ہوں۔ ڈھیل دی کہ پتنگ کٹی۔

وہ بولی۔ "تو آج لنچ پر آجاؤ۔ مگر دو گھنٹے کے بعد۔"

مگر اُس کی آواز میں کچھ زیادہ خوشی نہیں تھی۔ آواز بھی کچھ گھٹی گھٹی تھی۔

لنچ پر پہنچا تو بہت بدلی ہوئی نظر آئی۔ اُس نے اودے پھولوں والا ایک عمدہ فراک پہن لیا تھا۔ میک اپ بھی نیا تھا۔ آواز میں بھی شوخی اور طراری تھی... صبح کی اتفاقیہ ملاقات کی ساری سرد مہری غائب ہو چکی تھی۔

ہاتھ پکڑ کے گھر کے اندر لے گئی۔ بہت بڑا گھر تھا۔ پرانا اور ٹھوس فرنیچر۔ مشرقی ونگ کے کمرے نئے طریقے سے سجائے گئے تھے۔ ایک سوئمنگ پول بھی تھا۔

"اتنے بڑے گھر میں تم اکیلی رہتی ہو؟"

"نہیں۔ میرے ساتھ خادمہ بھی ہے۔"

"شادی کیوں نہیں کی؟"

"تمہارا انتظار جو تھا۔؟" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں نے اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ وہ ہاتھ جھٹک کر بولی۔ آرام سے چلو مسٹر! ابھی بہت وقت ہے۔" .. پھر لہجہ بدل کر بولی۔ "لنچ سے پہلے میں پول میں تیرنے کی عادی ہوں۔ تم نے تیرنا سیکھ لیا؟"

"نہیں۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ کیوں میں نے ایسا کہہ دیا۔ اُس کی وجہ آج تک میں نہ جان سکا۔ کیوں کہ اب میں نے تیرنا سیکھ لیا تھا جب گلمرگ میں کیٹ سے ملا تھا تو واقعی تیرنا نہیں جانتا تھا۔ مگر اب تیرنا سیکھ چکا تھا۔ پھر بھی ایک دم "نہیں" منہ سے نکل گیا تو اب اُسے نبھانا ہی پڑے گا۔

وہ میرا جواب سن کر خفا نہیں ہوئی۔ بڑی دلکشی سے مسکرائی اور میرا ہاتھ تھام کے بولی۔

"چلو سوئمنگ پول کے کنارے چل کر بیٹھیں گے۔ میں تیروں گی۔ تم دیکھنا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے!"

بڈھی خادمہ نے پول کے کنارے دو کرسیاں اور ایک میز لگا دی۔ کیٹ تیراکی کا

[illegible] ایک نیا اور بہت بڑا تولیہ لپیٹے ہوئے تھی۔

[illegible] اس نے [illegible] ہاتھ بڑھا دیا۔ اپنے آپ کو "یہی لفظ

[illegible]

اب چلیں تو پھر پتہ چلے۔" میں نے کہا۔

[illegible]

وہ [illegible] تیرنے لگی۔ اس نے وہ ٹیکنیک بتائی۔ ایک میرے [illegible] اپنے [illegible] ہلکے ہلکے بوسوں کے درمیان ہم کسلف پیتے رہے۔ اور ایک [illegible] آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتے رہے۔ جب بدن گرم ہونے [illegible] پانی میں کود گئی۔ میں سمجھتا تھا کہ جیسے کاب میں پھولوں بھری ننھی پول [illegible] ہو۔ میں کنارے کنارے نہاتا ہوا اُس سے باتیں کرتا رہا۔ اور وہ تیرتی رہی۔ [illegible] سے گزر کر وہ اُس طرف چلی گئی جدھر پول کا پانی بہت گہرا تھا۔ کافی عرصہ [illegible] پانی میں سے پھر [illegible] اچھلا۔ پھر اُس نے پول سے اندر ہی سے ایک جن دبایا اور پول کے اندر رنگارنگ لہریے روشنیوں کے [illegible]

[illegible] تمہیں تیرنا نہیں آتا۔ ورنہ میرے ساتھ تیرتے۔" وہ بولی۔

[illegible] مجھے [illegible] میں نے بے چین ہو کر اُس سے کہا۔ "اب جلدی سے باہر [illegible] مجھے [illegible] ہو رہی ہے۔"

[illegible] لگ رہی ہے تو نہا لو۔"

[illegible] کسلف سے نہیں جانے کی۔"

[illegible] "وہ تیرتے تیرتے [illegible] اور پول کا پانی بھی اُس سے جُدا ہونے سے اچھلا جیسے [illegible]

[illegible] وہ شریر نگاہوں سے مجھے دعوت دیتے ہوئے بولی۔

[illegible] تیرنا نہیں جانتا۔ تمہیں بتا چکا ہوں۔" میں نے افسردہ ہو کر اُس سے کہا۔

افسردگی اس لئے کہ جی چاہتا تھا۔ اور اب میرا دل یونہی اس جھوٹ بولنے پر لعنت ملامت کر رہا تھا کیسی حماقت ہوئی۔

"میرے لئے ایک ملٹ لاؤ۔" وہ تیرتی ہوئی پول سے باہر آئی۔ اور وہ میرے زینہ پر بیٹھ گئی۔ جو پانی کے اندر تک جاتا تھا۔ کیٹ کا آدھا جسم پانی کے اندر ڈوبا ہوا تھا۔ سینہ باہر تھا اور پانی کا سہارا اسے حاصل تھا۔

"اس بکنی کا فائدہ کیا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔ "سب کو کچھ تو نظر آتا ہے۔"

"میرے جسم پر جو کھال منڈھی ہوئی ہے۔ وہ بھی ایک طرح کی بکنی ہے۔ لیکن کیا تم اس کھال کے اندر کی بکنی کو دیکھ سکتے ہو؟"

"نہیں!"

"عورت کو ڈیفائن بہت مشکل ہے حالانکہ بہت سے بیوقوف مرد یہی سمجھتے ہیں کہ وہ بکنی کے اندر عورت کو دیکھ لیتے ہیں۔"

"عورت کو ڈیفائن ہو تو اس کی آنکھوں سے اندر جھانکا جا سکتا ہے۔ صاف وہیں پہ عورت نظر آتی ہے۔"

"اور باقی جسم؟" اس نے پوچھا۔

"ایک پنجرہ ہے چوہے کو پھنسانے کا؟"

"You think you are very smart"

"میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس سے لئے ایک ملٹ بنایا۔ جام اس سے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس کی نیلی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ جام آدھا میرے ہاتھ میں اور آدھا اس کے ہاتھ میں۔ میں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس نے اپنے ہونٹ چومنے لگا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ پھر اک دم میں نے بوسے کو ناتمام رکھ کر اسے چھوڑ دیا۔

اس کی بلغمی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

"کیوں۔ کیا ہوا؟" وہ بولی۔

"میں نے اپنے ہونٹ چاٹتے ہوئے کہا۔" معلوم ہوتا ہے پانی میں کلورین زیادہ ملی ہوئی ہے۔"

وہ ہنسی۔ ایک ہی گھونٹ میں جام خالی کر گئی۔ پھر بولی۔ "وہ کاجو کی پلیٹ اٹھا لاؤ۔"

میں پول کے کنارے سے اٹھا۔ میز سے کاجو لے آیا اور ایک ایک دانہ کر کے اس کے منہ میں ڈالنے لگا۔ وہ کھاتی گئی۔ اور کھاتے کھاتے بولی۔ "جب میں کاجو کھاتی ہوں تو مجھے اطالوی بہت یاد آتا ہے۔ تمہارے ملک کے مرد کتنے کاجو بہت شوق سے کھاتے ہیں۔"

"ہمارے ملک کے مردوں میں بھی نمک ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"شاید اسی لئے آسانی سے کھائے جا سکتے ہیں۔" وہ بولی۔ اس نے میری ناک کو پکڑ کے ذرا ہلایا۔ پھر زینے سے اچھل کر واپس پانی میں کود گئی۔

کافی دیر تک وہ نہاتی رہی۔ پھر پول سے باہر نکلی تو مجھ سے کہنے لگی۔

"تولیہ لے کر میرا جسم صاف کرو۔"

میں تولیہ لے کر اس کا بدن صاف کرنے لگا۔ بدن صاف کرتا جاتا تھا اور سچ سچ میں پاگل سے چھوتا بھی جاتا تھا۔ یہ بیٹھے بیٹھے۔ بدن صاف ہوا کہ نہیں۔ منہ اور کان کی لوؤں اور سینہ اور پیٹ رانوں سے گزرتا ہوا جب پنڈلیوں تک پہنچا تو کھٹک پول سے باہر بیٹھ گیا۔ اور تولیے سے اس کی پنڈلیاں رگڑنے لگا۔ پہلے دایاں پاؤں صاف کیا لیٹ نے صاف شدہ پاؤں ذرا سا اوپر اٹھایا۔ اور میں بایاں پاؤں صاف کرنے لگا۔ جب میں دونوں پاؤں صاف کر رہا تھا تو اس نے دایاں پاؤں اور اوپر اٹھا کر میرے [illegible] میں [illegible] میں اس کے دونوں پاؤں سے گہرے پانیوں میں [illegible] پانی میں [illegible] پنڈلیوں میں عمر کی وہ گہری آب یاد آئی۔ جہاں [illegible] تھا۔ میرا بدن سن ہو گیا۔ اور ایک سیکنڈ [illegible] میں میرے دماغ نے تیزی سے کام کرتے ہوئے اپنی

مدافعت کی ترکیب سوچ لی۔

"میں ڈوبا۔ میں ڈوبا جارہا ہوں۔ مجھے بچاؤ۔" میں نے پانی کی سطح کے اوپر آتے ہی احمقانہ طریقے سے ہاتھ پاؤں ہلاتے ہوئے کیٹ سے کہا۔

کیٹ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ کھڑی کھڑی ہنستی رہی۔

میں نے ایک غوطہ کھایا۔

دوسرا غوطہ کھانے کے بعد جب میں اُبھرا تو وہ اُسی طرح پول کے کنارے کھڑی تھی۔ اُس کا چہرہ غصے اور نفرت کے جذبات سے بھیانک سا دکھائی دے رہا تھا۔

"تم نے سوچا ہوگا۔ تم مجھے قابو کر سکو گے۔؟" وہ پھنکارتے ہوئے بولی۔

"میرا راز جان کر مجھے ہمیشہ بلیک میل کر سکو گے۔ یو ڈرٹی انڈین بلیک نیگرو آج تم وہی موت مرو گے جو گلبرگ کی ڈاب میں رٹلینڈ کو آئی تھی۔ اور پانی کی موت سب سے اچھی ہوتی ہے۔ یہ کوئی نشانی نہیں چھوڑ جاتی۔ یہ سیدھے سیدھے ایک بے وقوف ہندوستانی کا اتفاقیہ پانی میں ڈوب جانیکا حادثہ ہوگا۔ کیونکہ تیرنا تم جانتے نہیں ہو اس لئے موت سے بچ نہیں سکتے۔ دیکھا کتنی آسان ترکیب ہے!"

"مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ!" میں زور سے چلایا اور پھر پانی کے اندر جانے لگا۔

عین اُسی وقت قریب میں کہیں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور وہ میری طرف سے پیٹھ موڑ کر چلتی سنکتی ہوئی ایک کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس گئی اور ٹیلی فون اُٹھا کر کسی سے بات کرنے لگی۔

"ہاں ڈارلنگ مجھے یاد ہے نہیں اس وقت فرصت نہیں ہے شام کو آؤں گی۔ یس ڈارلنگ یس مائی اون (Yes my Own) شام کو ضرور ملوں گی... اکٹھے ڈنر کھائیں گے... ہاں... ہاں... بائی بائی ڈارلنگ۔"

وہ ایک نگاہ سے ٹیلی فون کو دیکھتی جاتی تھی۔ دوسری نگاہ سے مجھے۔ وہ سے دیکھتی جاتی تھی۔ ٹیلی فون بند کر کے وہ اُسی طرح مٹکتی ہوئی پول سے آئی اور میری طرف دیکھ کر بولی۔

"میں نے تمہارے آتے ہی خادمہ کو چھٹی دیدی تھی۔ اور اب گھر میں کوئی نہیں ہے اور میں اس وقت کپڑے بدل کر باہر جارہی ہوں۔ جب واپس آؤں گی تو تمہاری لاش پانی میں تیر رہی ہوگی۔ ایک چور ہندوستانی جو میری غیر حاضری میں کھڑکی توڑ کر میرے گھر میں گھسا۔ اور ڈوب گیا۔... بہت خوب۔ اچھا.. میرے پیارے خدا حافظ۔"

اُس نے پول کے کنارے سے ہاتھ ہلایا اور پھر تیز تیز قدموں سے کپڑے بدلنے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے غوطے کھانا چھوڑ دیا۔ اور ہولے ہولے پانی میں تیرنے لگا۔ اور سوچنے لگا۔

دس پندرہ منٹ تو لگیں گے اسے کپڑے بدلنے میں۔ اتنا وقت میرے لئے کافی ہے یہاں سے نکلنے کے لئے۔

میں نے چند لمحے اور پانی میں گزارے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کہیں وہ پھر واپس نہ آجائے پستول وغیرہ لے کر۔ جب چند منٹ اسی سناٹے میں گزر گئے تو میں آہستہ سے پول سے نکلا اور میرے کپڑے پانی میں شرابور ہو چکے تھے۔ مگر یہ وقت بدن تولئے سے خشک کرنے کا نہیں تھا میں انہی بھیگے ہوئے کپڑوں میں چلتا ہوا کسی طرح کی آواز نہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوا دو کمروں سے نکل کر باہر کے ہال میں آگیا۔ اور ہال کا دروازہ کھول کر باغیچے میں آگیا۔ اور باغیچے کا دروازہ کھول کر سڑک پر آگیا۔ جدھر جاتا تھا پانی کی ایک لمبی لکیر میرے ساتھ چلتی جاتی تھی۔ اور انگریز مڑ مڑ کر حیرت سے میری طرف دیکھتے جاتے تھے۔

"تمہیں پولیس کو مطلع کر دینا چاہئے۔" قادر یار نے مجھ سے کہا۔ میں اپنے دوست قادر یار کے گھر آتش دان کے سامنے ایک بہت بڑے تولئے میں لپٹا ہوا آگ تاپ رہا تھا۔ اور برانڈی کا ایک بڑا پیگ میرے اندر جا چکا تھا۔

"میں کل واپس اپنے وطن جارہا ہوں۔" میں نے قادر یار سے کہا۔ "اس لئے پولیس کو بتانے میں مجھے یہاں لامحالہ رکنا پڑے گا۔ اور پھر کوئی بہت بڑی بات بھی

نہیں۔ قتل تو اس معاشرہ، اس سسٹم کا خاصہ ہے اور قتل کو اپنے اندر سے خارج کر کے یہ معاشرہ ایک قدم نہیں چل سکتا۔ یہ قتل منظم ہو یا غیر منظم مگر ہمیشہ اس سوسائٹی میں چلتا رہتا ہے۔ کیوں کہ مفاد ٹکراتے رہتے ہیں۔ اس لئے قتل ہوتا ہے۔ اجتماعی طور پر اور انفرادی طور پر۔ گزشتہ جنگ عظیم میں ساٹھ لاکھ یہودی مارے گئے۔ اور پورے یورپ کا ضمیر خاموش رہا اس معاشرے میں جہاں شب و روز انسان کی یہ خوبصورت تمنا کا خون ہوتا ہے، ایک فرد کا قتل کیا معنی رکھتا ہے۔ پورا معاشرہ Trigger happy ہے۔ تم نے خود محسوس کیا ہوگا کہ مغربی ادیبوں سے افکار میں کسی بہتر زندگی کی تمنا، کسی خوبصورت مستقبل کا خواب نظر نہیں آتا۔ جس سسٹم میں آخری فیصلہ پستول سے ہوتا ہے، وہاں چاندنی راتوں میں شرمیلے پھولوں کی طرح مہکنے والے نرم و نازک جذبات یہ معنی رکھتے ہیں۔ زندگی سے نرم و نازک جذبوں کا رس نکل چکا ہے۔ اور اب تم کسی انسان کو چھو لو، دیکھو، وہ فولاد کی طرح سخت ہے۔ اور دھات کی مشین کی طرح عمل کرتا ہے۔"

"مگر ایسی عورت دوبارہ قتل کرنے کی کوشش کر سکتی ہے۔" قادر یار بولا۔

"اس کا میں نے بندوبست کر لیا ہے۔ ذرا وہ ٹیلی فون اٹھا کر میرے پاس رکھ دو۔"

میں نے قادر یار سے کہا۔

قادر یار ٹیلی فون اٹھا کر میرے پاس لے آیا۔ میں نے کیٹ کا نمبر ملایا اور اگلی آواز سنتے ہی میں نے صرف اتنا کہا۔

"کیٹ! میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا۔ میں تیرنا جانتا ہوں۔"

اس کے بعد میں نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ قادر یار میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

میں نے قادر یار سے کہا۔

اب وہ کبھی اطمینان سے نہیں سو سکے گی۔ میں تو کل چلا جاؤں گا۔ تمہارے تو معلوم نہیں ہے کہ میں کل چلا جاؤں گا۔ اور اب وہ کبھی اطمینان سے نہیں سو سکے گی

۔ میرے جانے کے بعد بھی وہ ہر روز، ہر رات اس لمحے کا انتظار کرے گی۔ جب میں اس سے بدلہ لینے کی کوشش کروں گا۔ ہر کھٹکا، ہر دروازے کی ہر دستک اسے وحشت زدہ کر دیتی۔ اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ اور چند لمحوں کے لئے وہ ہر موت سے ہاتھ اپنی گردن پر محسوس کرے گی۔ یہ سزا اس کے لئے بہت کافی ہے۔"

لندن کی آخری رات

کل میں چلا جاؤں گا۔ صبح سویرے

اسی لئے ابھی سے سامان باندھ رہا تھا۔ کیوں کہ آج رات کو وہ رہ نمی لندن نے مجھے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا۔ کہ وہ مجھے تم سے تم میں نئے شاعروں سے ملائے گی۔ اس لئے دعوت دیر تک چلے گی۔ ممکن ہے کہ رات بھر چلے۔ صبح مجھے سامان باندھنے کا وقت نہیں ملے گا۔ اس لئے ابھی یہ کام کر لیا جائے تو بہتر ہے۔

قادر یار اپنا میلا کچیلا۔ بے شمار سلوٹوں والا گون پہن کر میرے اردگرد ٹہل رہا تھا۔ بار بار سگریٹ کی راکھ جھاڑتا جاتا تھا۔ اور بیچ بیچ میں میری مدد بھی کرتا جاتا تھا۔ مگر بہت بے چین معلوم ہوتا تھا۔

"کوئی چیز تمہیں ستا رہی ہے؟" میں نے قادر یار سے کہا۔

"چند گھنٹے پہلے تم نے یورپ کی یہودی دشمنی کی جو بات کہی تھی اور اس سے جو نتائج اخذ کیے تھے۔ وہ مجھے صحیح نہیں معلوم ہوتے۔ یہ تو سچ ہے کہ ہٹلر نے تقریباً ساٹھ لاکھ یہودی جان سے مار ڈالے گئے۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ پورا یورپ ان کے قتل کے حق میں تھا۔ شریف یورپ نے شریف لوگوں نے شریف دانشوروں نے اس کے خلاف احتجاج بھی کیا!"

"مگر کتنا کم؟" میں نے کہا۔ "اور اس لفظی احتجاج سے کیا فرق پڑتا ہے

بعد بھی یہودیوں کا اخراج یورپ سے نہ رُک سکا۔ اُن کو یورپ میں بسانے کی پھر سے کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ بلکہ اُن کے خاموش اخراج کی ہر ممکن سعی کی گئی۔ اور انہیں یورپ سے نکال کر ایک الگ خطہ زمین دیدیا گیا۔ اور وہ بھی عربوں سے چھین کر۔ دوسرے کی زمین کو چھین کر کسی تیسرے کو دیدینے میں کیا فیاضی ہے؟ میں تو جب مانتا کہ یورپ کا ضمیر جاگا ہے۔ جب یہودیوں کو عربوں کے گھروں میں آباد کرنے کے بجائے انہیں اُن گھروں میں بسایا جاتا، جہاں سے وہ نکالے گئے تھے۔ جب مجھے کسی یورپی پچھتاوے کا احساس ہوتا۔ اب تو نہیں ہے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ یہاں سے تم یورپ دشمن ہو کے جا رہے ہو۔" قادر یار بیزاری سے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا۔ "یہ رجحان صحیح نہیں ہے۔"

"میں یورپ کا دشمن نہیں ہوں۔ یورپ نے پچھلے چار سو سال میں دُنیا کی تہذیب اور زندگی کو جو کچھ دیا ہے وہ باقی دُنیا کے سارے ملکوں نے مل کر بھی نہیں دیا ہے۔ اس سے بھی انکار ناممکن ہے کہ مختلف قومی نسلی اور جغرافیائی حد بندیوں کے باوجود دُنیا کے ہر خطے کے لوگ ذہنی اعتبار سے یورپین ہوتے جا رہے ہیں۔ جو عالمی تہذیب آج مر رہی ہے وہ یورپ کی دین تھی اور جو دوسری عالمی تہذیب اُس کے بطن سے نکل رہی ہے وہ بھی یورپ کی بیٹی ہے اس کا بھی میں فراخدلی سے اقرار کرتا ہوں۔"

"پھر تمہیں یورپ سے کیا گلہ ہے؟"

"آج یورپ کے پاس کوئی خیال نہیں ہے۔ کوئی چونکا دینے والا خیال۔ بھک سے اُڑا دینے والا ایٹم بم تو ہے۔ لیکن دھک کر دینے والا کوئی ایسا خیال نہیں ہے جو اپنے نور سے ساری دُنیا کو روشن کر دے۔"

"اگر ایسا ہے تو تم دُور تھی مور کی دعوت میں کیوں جا رہے ہو؟"

"وہاں میں شاعر ہوں گے۔ میں نئے مغربی یورپ کے ذہن کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ اور تم جانتے ہو کہ کسی بھی تہذیب کا بہترین پیمانہ اُس کا ادیب اور شاعر ہوتا ہے۔ ذرا دیکھیں۔"

ڈورتھی گھورتے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ اپنے دروازہ میں بالکل ننگی کھڑی تھی۔

"سوری کورس۔" وہ مجھے دیکھ کر خوشی سے چلائی۔ "یہ تم ہو، میرا اقیافہ بالکل صحیح نکلا۔"

میں کچھ کہہ نہ سکا۔ بس حیرت سے اُسے تاکے جا رہا تھا۔

"اندر آجاؤ۔" اُس نے اپنے ننگے بدن میں ایک جھرجھری محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "اندر آجاؤ۔ ورنہ میں دروازے کے اندر کھڑی جم جاؤں گی۔"

"میں دروازے کے اندر چلا گیا۔ اُس نے فوراً دروازہ بند کر دیا!

"بیٹھو!" اُس نے ایک صوفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور جب میں صوفہ میں دھنس گیا تو وہ مجھے سگریٹ پیش کرنے لگی۔

"تم ننگی کیوں ہو؟" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

"کون کہتا ہے۔ میں ننگی ہوں۔"

"میں کہتا ہوں۔"

"تم کہتے ہو۔ مگر تم کیسے کہتے ہو یہ؟ ذرا سوچو میں ڈورتھی گھور۔ ایک شاعر کی روح اس بدن میں بند ہے۔ یہ بدن کیا ہے۔ روح کا لباس ہے۔ اب تم چاہتے ہو کہ اس لباس کو بھی میں اور ایک لباس پہنا دوں۔؟ کتنی بڑی حماقت ہے! بھلا کوئی کپڑے کو بھی کپڑے پہناتا ہے؟ ہوائے انسان کے میں نے کسی دوسرے جاندار میں یہ حماقت نہیں دیکھی۔!"

وہ میرے قریب آ بیٹھی اور مجھے اُس کے جسم سے لیوندر کی خوشبو آنے لگی۔

"خوشبو کے معاملہ میں تم بہت قدامت پرست ہو۔" میں نے ڈورا سے کہا۔

ڈورا ہوں۔" یوں تو میں بہت پرانی ہوں۔ سوری کورس۔ بہت پرانی جب میں اپنے فلیٹ میں کپڑے اُتار دیتی ہوں تو لگتا ہے میں دنیا کی پہلی عورت ہوں۔"

"اس وقت تو مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ پڑے اُتار دوں

اور دنیا کا پہلا مرد بن جاؤں۔"

"نہیں۔" وہ زور سے چیخی اور میرا ہاتھ تھام کر بولی۔ "تم کپڑے پہنے رہو اور مجھے محسوس کرنے دو کہ میں دنیا کی پہلی عورت ہوں جو بیسویں صدی میں آئی ہے۔"

"یعنی میں بیسویں صدی ہوں۔"

"سوری کورس۔"

پھر وہ میری بغل سے اُٹھی اور دو قدم ہٹ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ پھر اپنی ایڑی پر گھوم گئی۔ بولی۔

"میرا بدن کیسا ہے؟"

"وہ جیسا ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر مجھے صندلی بدن بہت پسند ہیں۔ یا ایسے بدن جن کی رنگت میں سفولاہٹ ہو۔"

"جھوٹ بولتے ہو۔ سفید رنگ ہر ایک کو پسند ہے۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں کہ انسانوں نے مختلف رنگ سب ایک سے اچھے ہوتے ہیں اصل بات یہ ہے کہ جتنے ایشیائی، افریقی اور زرد رنگت والے ہیں سب کے سب سفید رنگ کو دل ہی دل میں پسند کرتے ہیں۔ سفید رنگ ہی برتر۔!"

"کیسے؟"

"کیوں کہ زیادہ حسین ہے۔"

"کیسے؟"

"کالی لڑکی کی تعریف آج تک کس ملک کی شاعری میں ہوئی ہے؟ مجھے ذرا بتا دو۔ نسلی امتیاز کو اور گوری چمڑی کو بُرا کہنے والے خود کیوں سفید رنگ کو اس قدر پسند کرتے ہیں۔؟ صاف اور کھلتے ہوئے رنگ پر سب کی جان جاتی ہے چاہے ہندوستانی ہوں یا افریقی حبشی یا زرد رنگ کے منگول۔ سبھی ہماری رنگت کے دیوانے ہیں۔ مجھے ایک ہندوستانی نے بتایا تھا کہ تمہارے ہاں خود اخباروں میں جتنے اشتہار شادی کے لئے چھپتے ہیں سب میں گوری صاف ستھری اور کھلتی ہوئی رنگت کی فرمائش ہوتی

ہے۔ جنوبی ہند میں بھی جہاں تقریباً تمام فیصدی لوگوں کا رنگ کالا ہے وہاں بھی گوری لڑکی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں کیوں؟ ادھر افریقہ میں، لیبیریا جو افریقی ذرا پڑھ لکھ جاتا ہے فوراً کسی سفید رنگت والی لڑکی سے شادی کرنے کی سوچتا ہے۔ آزاد افریقی ملکوں کے کتنے ہی وزیروں نے اپنے ملک کی حبشی لڑکیوں کو چھوڑ کر یورپین عورتوں سے شادی کی ہے۔

میں پوچھتی ہوں کیوں۔؟ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ اگر کل کالوں کو ہمارے سائنس داں کوئی ایسی دوا یا انجکشن تیار کرنے میں کامیاب ہو جائیں جس سے کالے لوگوں کی رنگت سفید رنگت میں بآسانی تبدیل ہو سکے تو تم دیکھو گے کہ اس دنیا کے نوے فیصدی لوگ تمہارے کالے لوگ سفید فام ہو جانے کیلئے بے قرار ہو جائیں گے۔ مگر جو حقیقت ہے اُسے تم لوگ نہ چھپاتے ہو۔ دل ہی دل میں سفید رنگت کو پسند کرتے ہو، اوپر سے ہمیں گالیاں دیتے ہو۔ اندر سے کڑھتے ہو، جلتے ہو۔ اور جب بس نہیں چلتا تو گالیاں دیتے ہو۔ بالکل اُس بدصورت عورت کی طرح جو اپنے سامنے ایک حسین عورت کو دیکھ کر جلتی ہے۔ اور اُس کے حسن سے منکر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تم بھی سفید رنگ کی برتری سے منکر ہو۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"آف کورس!" میں نے کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

میں نے کہا۔ "ایک روز میں نے پیڈلی میں ایک جمیکن کالی لڑکی دیکھی تھی۔ میں بتا نہیں سکتا کہ وہ کس قدر حسین تھی۔ مرد تو مرد، تمہاری کئی انگریز لڑکیاں اسے دیکھنے کیلئے چلتے چلتے ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ حبشی مرد اپنی اُٹھی ہوئی گردن اور چوڑے سینے کے ساتھ کس قدر وجیہہ معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک کی مالنولیاں تم نے نہیں دیکھیں کالی آنکھوں والی سفید دانتوں والی۔ محراب دار بھنوؤں والی۔ یہ ہوں پیٹھ تک بکھرائے ہوئے بیٹھی ہیں۔ اگر تم دیکھ لو تو احساس کمتری سے پانی پانی ہو جاؤ۔ فطرت نے ہر نسل کو اپنی طرح کی خوبصورتی عطا کی ہے۔ اپنی جگہ تم بھی حسین

خوبصورت ہے۔ تمہیں دیکھ کر مجھے ایک اُردو کے شاعر مخدوم کی ایک نظم یاد آتی ہے۔

دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے ۔۔۔ میکدے سے ذرا دور ۔۔۔ جب میں نے اُسے ترجمہ کر کے سمجھایا تو دُور تھی بولی۔ "میکدے سے یاد آیا کہ ہم لوگ کیا کر رہے ہیں۔ پیتے کیوں نہیں؟"

میں نے کہا۔ "میں اُن بیس شاعروں کا انتظار کر رہا تھا، جن سے ملانے کا تم نے وعدہ کیا تھا۔"

"وہ آجائیں گے۔ ہم شروع تو کریں۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھی اور دو جام بنا کر لے آئی۔ اب میں اُس کی عریانی بھول چکا تھا۔ بلکہ اب اُس کی عریانی ہی ایک طرح کا لباس معلوم ہوتی تھی۔

میں نے اُس سے پوچھا۔ "جیمیہ کہاں ہے، کئی دن سے اُسے نہیں دیکھا۔ دو تین بار ٹیلی فون بھی کیا۔ مگر کسی نے ٹیلیفون اُٹھایا تک نہیں۔"

"آجکل سوگ میں ہے۔"

"سوگ کیسا؟"

"نام کی بے وفائی کا۔" (یہ تھا مس بلفورڈ کی طرف اشارہ تھا)

"وہ شرمیلا ہیلشر؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں!۔ اس عمر میں بھلا جیمیہ کو اُس لونڈے سے عشق کرنے کی کیا سوجھی؟ یہ تو یونہی ہونا تھا۔"

"مگر جیمیہ آج بھی غضب کی چارمنگ ہے۔"

"وہ تو ہے۔ مگر۔ مگر۔۔۔" وہ رُک گئی۔

"مگر کیا۔؟"

"تم کو معلوم نہیں۔" اُس نے مجھ سے پوچھا۔ پھر خود ہی کہنے لگی۔

"آف کورس۔ تمہیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ نام ہو مو (home) ہے۔ وہ عورتوں کو پسند نہیں کرتا۔ اپنے سے بڑے عمر کے مردوں کو پسند کرتا ہے۔ اُسے

اُس بڈھے انگریز لو یب سے عشق ہے جو اُس روز ہمیں او تھیلوز میں ملا تھا۔"

"فرینک بیفسن؟"

"وہاں!" ڈورا نے آہستہ سے سر ہلایا۔ اور غور سے جام کے سنہری رنگ کو دیکھنے لگی۔ پھر افسردگی سے سر ہلا کر بولی۔ "بے چاری جیبہ!"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بڑھتی ہوئی افسردگی کے ساتھ بولی۔ "ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ جو عورتوں کو پسند نہیں کرتے۔ کہتے ہیں ۔ عورت تو ایک تجربہ ہے۔ کوئی خاص انوکھی الگ بات ہونی چاہئے۔ اس لئے وہ مخالف جنس کو چھوڑ کر ہم جنسی پر اُتر آئے ہیں۔ They want Something Unusual حالانکہ ہم جنسی بھی کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں ہے، بہت پرانی بات ہے!"

میں نے کہا۔ "مگر نیڑھے سماج میں ہر چیز نیڑھی ہونے لگتی ہے۔ معاشرہ نیڑھا ہو تو خواہشیں بھی نیڑھی ہونے لگتی ہیں۔ اور ان کے حصول کے ذرائع بھی۔ فطری حسن کی جس تک منعکوس ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی ہر زوال پذیر تہذیب اپنے اختتام کو پہنچتی ہے Not with a bang but with a Whimper!۔"

ڈورا بولی۔ "میں نے بھی کئی بار جیبہ کو ٹیلی فون کیا۔ مگر اُس کی خادمہ نے کہا۔ وہ کسی سے ملنا نہیں چاہتی Very Crude-very اگر جیبہ بڈھی ہو گئی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اگر اُس کا ہوائے فرینڈ ہو مو ہے تو میں کیا کروں؟"

ڈورا نے یہ کہتے ہوئے اپنے لب بڑے پیارے انداز میں باہر پھیلا دے۔

"بھول جاؤ اُسے۔" میں نے اُس سے کہا۔ اور یہ دیکھو کہ دیوار پر تمہارا سایہ کتنا حسین ہے۔ کتنا تیکھا اور نوکدار۔ جیسے کسی پنسل کی تیز نوک سے کسی مصور نے تمہارا چارکول اسکیچ بنا دیا ہو۔ یہ Nude تو ماتیس کے بس کا بھی نہیں ہے!"

وہ دیوار پر اپنا سایہ دیکھنے لگی۔ سایہ اُسے دیکھنے لگا۔ میں اُن دونوں کو دیکھنے لگا۔

ایک کالی عورت، ایک سفید عورت، ان دونوں کو الگ کیسے کیا جائے گا؟ وہ دونوں

کا ساتھ ازل سے ہے۔

یکایک وہ پھر کھڑی ہو گئی۔ "آؤ ناچیں!"

اُس نے ریکارڈ پر جاز کا ایک ریکارڈ لگا دیا۔ اور سرک کر میری بانہوں میں آ گئی۔ اور ہم دونوں کمال سے کمال لگا کر ناچنے لگے۔

مرہ خواب کر رہا تھا۔ دیواروں پر سائے ناچ رہے تھے۔ نیم تاریک دھندلاہٹوں میں وہ دھندلی سی بیٹھی میں پگھلتے ہوئے وقت سے چاک پر مٹی کے دو آبخورے، زندگی کی شراب سے چھلکتے ہوئے۔ آنکھیں بند کئے ہوئے ناچتے ہوئے۔ اس کمرے سے باہر کچھ نہیں تھا۔ اس لمحے سے پہلے کچھ نہیں تھا۔ اس لمحے کے بعد کچھ نہیں ہے۔

میں نے ہاتھ باگ پر ہے، مدہ پا ہے رکاب میں!

بس ایک لمحہ کی پیچ میں جھولتے ہوئے۔ کسی ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح زندگی کی تاریک رات کی بے پناہیت و ہمور کرتے ہوئے۔ بس ایک پل کی چکا چوند روشنی۔ پھر اندھیرا۔ اندھیرا اُس سے خوف سے اور بھی لپٹ جانے کو جی چاہتا ہے۔"

یکایک بند کمرے میں سے باہر ایک زور کا دھماکا ہوا اور ایک ایسی گرج پیدا ہوئی جیسے ایک ساتھ ایک لاکھ توپیں چل گئی ہوں۔ کھڑکیوں کے کانچ زور زور سے جھنجھنا اٹھے اور دروازے چیخ مار کر مجھ سے الگ ہو گئے۔ اور بھاگتے ہوئے ایک بڑے صوفے کے نیچے جا گھسے۔

"بم.... بم... ایٹم بم!"

میں نے اُسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "یہ ویسی بمباری نہیں ہے۔ بادل گرج رہا ہے باہر۔ ذرا غور سے سنو!"

وہ صوفے کے نیچے دبکی ہوئی اپنا سر نیچا کئے اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر چھپائے ہوئے سر ہلا ہلا کر میری بات ماننے سے انکار کر رہی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے گھسیٹ کر اُسے صوفے سے باہر نکالا۔

"ہمدونوں محفوظ ہیں۔ دیکھ لو۔" میں نے اُس سے کہا۔ "اور سنو! تمہارا ریکارڈ

ابھی تک چل رہا ہے۔ کوٹ پہن لو۔ تم سر سے پاؤں تک کانپ رہی ہو۔"

اُس نے کپڑے پہننے سے انکار کر دیا۔ مگر اُس نے بہت جلد اپنے خوفزدہ احساس پر قابو پالیا۔ اپنے بال ٹھیک کئے۔ آئینہ دیکھ کر لپ اسٹک سے اپنے ہونٹ سنوارے۔ اس دوران میں وہ بار بار اپنے ہاتھ سے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیتی تھی۔ جیسے میرا ہاتھ نہ ہو، زمین کا محور ہو۔ کمرے کا فرش ہو۔ زندگی کا ثبوت ہو۔ پھر اُس نے گلاس اُٹھا کر بہت سی شراب اُس میں اُنڈیلی اور اُسے غٹا غٹ پی گئی۔ پی کر قریب کے دیوان پر دراز ہو گئی اور مجھ سے بولی۔

"تھوڑا میری پیٹھ سہلاؤ"

میں اُس کی پیٹھ دھیرے دھیرے سہلانے لگا۔ وہ دھیرے دھیرے سسکتے ہوئے لہجہ میں کہنے لگی۔

"وہ لوگ ہمیں عبث بدنام کرتے ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے ہمارا ماضی ہم سے چھین لیا۔ اور ہمارا مستقبل ہم سے نوچ لیا۔ اور ہمارے سر پر ایٹم بم کو لا کر کھڑا کر دیا۔ کیوں ہمیں بدنام کرتے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ جو بم ناگاساکی پر گرا تھا، وہ صرف ناگاساکی پر گرا تھا؟ وہ ہم پر بھی گرا تھا اور اُس نے ہمارے ذہن، تہذیب کلچر، خواب، صورتیں۔ خواہشیں، ہر شے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے ہیں۔ تم لوگوں نے اپنی زندگی ایک مضبوط زمین پر گزاری ہے۔ ہم لوگ بم کے فیتے پر کھڑے ہیں۔ پھر کیوں نہ ہم اس لمحے کو آخری جانیں اور زندگی کے سارے خوبصورت رشتے بھول جائیں۔ ہمیں موت کے دہانے پر کھڑا کر کے پوچھتے ہو کہ ہمارے احساس اس قدر ننگے کیوں ہیں؟ روایت اور مستقبل دونوں کو چھین کر جاننا چاہتے ہو کہ ہم اس قدر غیر ذمہ دار کیوں ہیں؟ کیسا بھونڈا مذاق ہے اس دُنیا کا... آؤ! مجھے اپنی باہوں میں کس لو۔ اتنے زور سے پیار کرو کہ تمہارے دانت میرے ہونٹوں میں گڑ جائیں۔ اور اُن سے خون بہہ نکلے۔"

وہ دانت پیس کر بولی۔ "مگر تمہیں تو نشہ ہی نہیں ہو رہا ہے۔ تم کیا پانی پی رہے ہو؟"

اُس نے دیوان سے اُٹھ کر ایک بڑا جام زبردستی میرے منہ سے لگا دیا اور سارا مجھے

پلا دیا۔ پھر وہ دیوان پر لیٹ گئی اور بولی۔ "میری پیٹھ اچھی طرح سہلاؤ!"

میں نے بات کا رُخ بدلنے کی غرض سے کہا۔ "وہ تمہارے میں شاعر کہاں ہیں۔ جن سے ملوانے کا تم نے وعدہ کیا تھا!"

وہ اکدم غصے سے اُٹھی اور دیوان کے قریب ایک بک شیلف سے ایک کتاب گھسیٹ کر بولی۔ "یہ رہے تمہارے بیہودہ شاعر، ملوان سے۔!"

کتاب کا نام تھا۔ "میں نئے شاعر۔"

"آؤ ملوان سے۔!" وہ کتاب کے ورق اُلٹتے ہوئے بولی۔

"یہ ڈبلیو، آر راجرز ہے۔ سنو کیا کہتا ہے:

In that land alls' flat , indifferent, there is neither Springing house, nor hanging tent, No aims are enter tained, and nothing is meant, for there are no ends or trends, no roads, only follow your nose to any where.

"اس ملک میں ساری زمین چپٹی ہے۔ بے کار اور وہاں کوئی گھر ہے نہ خیمہ۔ وہاں کوئی مقصد نہیں ہے اور کسی بات کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ کوئی منزل نہیں ہے۔ نہ کوئی رجحان۔ نہ کوئی جادو۔ ناک کی سیدھ لے کر جہاں چاہو چلے جاؤ۔!

یہ رائے فلر (Roy Fuller) ہے۔ اس کی بات سنو۔

Perhaps in spring the Ambassadars will return, before that we shall find perhaps that Bomb, Books, people, planets worry, our wives are not at all important perhaps the preposterous fishing line tangle of undesired Human existance will suddenly unravel. Before some staggering equation or mystic experience, and God be released from the moral particle or blue light room or, better still, we shall, before Anything really happens, be safely dead.

"شاید موسم بہار میں ہمارے سفیر لوٹیں گے۔ اُن کی آمد سے پیشتر ہی شاید ہمیں معلوم ہو گا کہ بم اور کتابیں، لوگ اور سیارے اور ہمارے دُکھ، حتیٰ کہ ہماری بیویاں تک

بھی ہمارے لئے اہم نہیں ہیں۔

یہ مضحکہ خیز ہنسی کی ڈور جو ہماری بیزار زندگی ہے شاید کسی روحانی قبر سے کسی عظیم فلسفے کی مچھلی کو پکڑ لائے۔ اور خود آزاد ہو جائے۔

اخلاق کے لاسے سے یا نیلگوں روشنیوں والے کمرے سے (آسمان سے) یا اس سے بھی بہتر، شاید اس سے پیشتر کہ کوئی خاص بات ہو، ہم بڑے اطمینان سے مر جائیں۔!"

یہ جان ہیدا سٹیبلس (John Heath stables) ہے۔

This is a hideous wicked country sloping to hateful sunsets and the end of time Hollow with mine shafts, naked with granite, fanatic with Sarrow. Abortions of the past hop through these hogs; black faced, the villagers remember burning by the stones.

"یہ ملک بدمعاش، بدصورت، نفرت زدہ، سورج کی طرح ڈھلتا ہوا۔ وقت کی آخری حدود کو جاتا ہوا۔ کھوکھلا۔ کان میں گاڑے ہوئے کندوں کی طرح ننگا چٹانوں کی طرح، متعصب غم کی طرح۔ یہاں کی دلدلوں میں ماضی کے اسقاط دوڑتے ہیں۔ کالے اور تاریک چہروں والے کسان یاد کرتے ہیں

اُن کو جو پتھروں پر جلائے گئے تھے۔"

ڈورا نے کتاب زور سے پھینک دی۔ کتاب اُڑ کر ریکارڈ پر جا گری۔ ریکارڈ اوندھا ہو گیا۔ میوزک بند ہو گیا۔ ڈورا نے اپنے بال جھلا کر غضب ناک لہجہ میں کہا۔

"جہنم میں جائے شاعری!"

"جہنم میں جائے شاعری!" میں نے اُسی لہجے میں دوہرایا۔ میں اب اُسے خوش کرنے پر تل گیا تھا۔

"جہنم میں جائیں ورڈزورتھ، براؤننگ۔" وہ بولی۔

"شیلے، کیٹس، بائرن۔" میں نے لقمہ دیا۔

"ملٹن۔ پوپ اور ڈرائیڈن۔" وہ بولی۔

"گائزوردی۔ شا۔ بارڈی۔" میں بولا۔ کیوں کہ میں اُسے خوش کرنا چاہتا تھا اور میں اُسے اس لئے خوش کرنا چاہتا تھا کیوں کہ اُس کے بدن کا لمس بے حد چکنا ملائم اور بالائی کی طرح نرم اور دبیز تھا۔ وہ لمس میرے احساسات میں ہلچل پیدا کر رہا تھا۔

"جہنم میں جائیں تہذیب اور کلچر۔!"

"سائنس اور فلسفہ۔" میں نے اپنا ہاتھ اُسکی ننگی کمر پر رکھ دیا۔

"جہنم میں جائیں آئن سٹائن۔" وہ میری گردن میں ہاتھ ڈال کے بولی۔

"جہنم نصیب ہو شیکسپیر کو۔" میں اپنے ہونٹ اُس کے ہونٹوں کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔

یکایک اُس نے دونوں ہاتھوں سے مجھے دھکا دیا اور تڑپ کر کھڑی ہو گئی اور دیوان کے تکیے اُٹھا اُٹھا کر مجھے مارنے لگی۔ اور جب تکیے ختم ہو گئے تو کتابوں کے شیلف سے کتابیں نکال نکال کر انہیں اینٹوں کی طرح میری طرف پھینکنے لگی۔ وہ غصہ بھری ہوئی شیرنی کی طرح مجھ سے کہہ رہی تھی۔

"How dare you insult Shakspeare" "ہمارے شکسپیر کی بے عزتی کرتے ہوئے۔ شیطان، بدمعاش، کتے، نکل جاؤ میرے گھر سے۔!"

"سنو تو۔ ذرا میری تو سنو۔" میں مدافعت کرتے ہوئے اُس کے وار سے بچانے کے لئے پیچھے ہٹتا چلا جا رہا تھا۔ مگر وہ آگے ہی بڑھتی جا رہی تھی۔ اُس نے مجھے دھکا دے کر اپنے فلیٹ سے باہر نکال دیا اور دروازہ بند کر دیا!

میں فلیٹ کے باہر سیڑھیوں پر اپنے سر کو تھامے ہوئے بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموش رہا۔ غصے سے بھرا ہوا۔ چند لمحے تاوے کی طرح جلتا، بھنتا بیمار ہا۔ جی چاہتا تھا مکے مار مار کر دروازہ توڑ دوں۔ پھر جب صورت حال پر غور کیا تو بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی۔ میں کسی طرح اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ قہقہہ مار کے ہنسنے لگا۔ میں زینے سے اُٹھا اور ڈور تھی کے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹا کے بولا۔

"سنو ڈورا۔ دروازہ مت کھولو۔ صرف میری بات سن لو! سنو ڈورا؟

میں نے تمہیں غلط سمجھا۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ تمہارے دل میں شیکسپیر زندہ ہے جب تلک شیکسپیر زندہ ہے انسان کی اُمید زندہ ہے۔ میں جاتا ہوں۔ میرا جہاز اب سے ٹھیک چار گھنٹے بعد ایرپورٹ سے چلا جائے گا۔ خدا حافظ۔ ڈورا سوئٹ ہارٹ۔!!"

اتنا کہہ کر میں زینے سے نیچے اُتر آیا۔ گھڑی دیکھی۔ چار بج رہے تھے۔ لندن سو رہا تھا۔ برف کے نیلگوں سناٹے میں ٹھٹھرا ہوا۔ سپیدۂ سحر کے پہلے بس کا انتظار کر رہا تھا۔ ڈورا کے فلیٹ میں ابھی تک روشنی تھی۔

ایرپورٹ پر وہ مجھ سے ملنے کیلئے آئی۔ اُس نے فان رنگ کا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ اور اُس کی آنکھوں کی بنفشی پتلیاں روشن اور شاداب نظر آتی تھیں۔ آتے ہی اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور متاسف لہجہ میں بولی۔ "رات کو میں زیادہ پی گئی تھی۔"

"کوئی بات نہیں۔"

"رات کو تم بہت اچھے تھے۔ بہت سلیقے والے۔ بہت پیارے!"

میں نے جھک کر اُس کا ہاتھ چوما۔

"تم مجھے خط لکھو گے نا؟" وہ شرما کر بولی۔

"نہیں۔" میں نے اُس سے کہا۔ "تمہارے ذریعہ سے میں نے نئی۔ مگر انگریز نسل کو پہچانا۔ یہی پہچان کیا کم ہے۔؟ خط لکھنے سے کیا فائدہ ڈورا!!

وقت بہت گزر جائے گا۔ تم مجھے بھول جاؤ گی۔ میں تمہیں بھول جاؤں گا۔ پھر وقت کے کسی اجنبی موڑ پر کسی انجانے لمحے میں یاد کی وادی میں گھومتے گھومتے میں اچانک تمہارا چہرہ پہچان کر ٹھٹھک جاؤں گا اور اس طرح میں اپنے وطن اور تم اپنے وطن میں اپنی اپنی زندگی کے راستوں چلتے ہوئے ہم دونوں ایک دوسرے کو یاد کریں گے۔ اور جن لمحوں میں ہم یاد کریں گے وہ ہمارے خط ہوں گے۔!"

"پہلے تو وہ کچھ نہیں بولی۔ چند لمحے کھڑی کھڑی عجیب نگاہوں سے مجھے تاکتی رہی پھر اک دم مسکرا کر کہنے لگی۔ "آف کورس!"

"آف کورس" کہہ کر وہ میرے کوٹ میں ایک پھول ٹانکنے لگی۔ میں اُس کی

آنکھوں کے بنفشی پھول دیکھتا رہا۔

آواز آئی۔

"اٹینشن پلیز۔ فلائٹ نمبر ٹو۔ اے ون کے مسافر! فلائٹ نمبر ٹو اے ون کے مسافر۔! کونٹر پر آجائیں۔ دس از دی لاسٹ کال۔"

"دی لاسٹ کال ڈورا!۔ خدا حافظ۔"

ختم شد

لندن خصلت رنگ